JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
SCHOOL OF LANGUAGES

Gram : JAYENU

Telephone : 652282
652114

New Mehrauli Road,
NEW DELHI-110067.

20 July, 1987

Certified that the material in this dissertation entitled " Impact of Freedom Movement on Prem Chand's Novels with Special Reference to Maidan-e-Amal " submitted by Mohammad Zakaria has not been previously submitted for any other degree of this or any other University.

(S.R. KIDWAI) 21/7/87
CHAIRPERSON
CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
SCHOOL OF LANGUAGES
JNU

(DR. N.A. KHAN) 21/7/87
SUPERVISOR
CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
SCHOOL OF LANGUAGES
JNU

IMPACT OF FREEDOM MOVEMENT ON PREM CHAND'S NOVELS
(With Special Reference to Maidan-E-Amal)

Dissertation For M. Phil. (Urdu)

Submitted

by

MOHAMMAD ZAKARIA

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
SCHOOL OF LANGUAGES
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
NEW DELHI-110067

1987

پریم چند کے ناولوں میں تحریک آزادی کے اثرات

(میدان عمل کی روشنی میں)

مقالہ برائے ایم فل (اردو)

محمد زکریا

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لینگویجز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

۱۹۸۷ء

فہرست

پیش لفظ ---- ۶ تا ۸

باب اوّل:- پریم چند کا سیاسی شعور ---- ۹ تا ۳۵

سیاسی شعور کا مفہوم —— فنی تخلیق اور سیاسی شعور —— پریم چند کے دور کے سیاسی ماحول کا پس منظر —— "میدانِ عمل" میں پریم چند کا سیاسی شعور

باب دوم:- پریم چند کا عہد: سیاسی و سماجی صورت حال ---- ۳۶ تا ۵۸

راجہ رام موہن رائے اور انکی سماجی اصلاحیں —— ہندوستان میں مختلف مذہبی اور سماجی تحریکیں —— سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک —— آریہ سماج تحریک اور پریم چند —— ترقی پسند تحریک اور پریم چند

باب سوئم:- پریم چند اور تحریکِ آزادی ---- ۵۹ تا ۸۴

ہندوستان میں تحریکِ آزادی —— انڈین نیشنل کانگریس اور جدوجہدِ آزادی —— گاندھی جی اور تحریکِ آزادی —— پریم چند کے یہاں آزادی کا تصور —— تحریکِ آزادی اور پریم چند

باب چہارم:- "میدانِ عمل" میں تحریکِ آزادی کے اثرات ---- ۸۵ تا ۱۱۰

"میدانِ عمل" کا فن —— "میدانِ عمل" کا موضوع —— "میدانِ عمل" کے کرداروں میں سماجی و سیاسی شعور —— کرداروں میں تحریکِ آزادی کی کشمکش —— نتائج

کتابیات ---- ۱۱۱ تا ۱۱۳

پیش لفظ

پریم چند اردو کے سب سے اہم اور قابل توجہ ناول نگار ہیں۔ اہم اور قابل توجہ اس لئے کہ عمومی طور پر ہندوستانی عوام اور خصوصی طور پر ہندوستانی کسانوں و محنت کشوں کی زندگی اور ان کے مسائل کا حقیقی اور واقعی اظہار اردو ناول میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ پریم چند کے یہاں نظر آتا ہے۔ حقیقت نگاری کی سب سے اہم مثال ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" ہے۔ جو کہ برطانوی حکومت کے ہاتھوں ضبط کرلیا گیا تھا۔ اس کے باوجود پریم چند آخری وقت تک ہندوستانی عوام خصوصاً دیہاتی زندگی کے مسائل اور ان سے جڑی ہوئی تلخ کامیوں اور کرب انگیزیوں کو اپنے غور و فکر اور مطالعہ و محاسبہ کی سہنائی میں پیش کرتے رہے۔

پریم چند کے یہاں ایک طرف گاندھیائی نقطہ نظر کارفرما ہے۔ جو غلامی سے نجات حاصل کرنے کی خواہش کو جنم دیتا ہے تو دوسری طرف استعماری قوتوں کے خلاف شدید احتجاجی رویہ بھی ملتا ہے۔ ان کے یہاں اگر کسانوں اور عورتوں کے بنیادی سیاسی سماجی و اقتصادی مسائل اور ان کے تئیں محبت اور حوصلوں کا احساس ہے تو دوسری طرف معاشی و معاشرتی آزادی اور اس کے تحفظ اور بقا و استحکام کے لئے اشتراکی حکومت کے قیام کی آرزو اور امنگ بھی۔

پریم چند کی ادبی خدمات کا بہت سے
ناقدین ادب نے جائزہ لیا ہے۔ خصوصاً قمر رئیس، شکیل الرحمٰن، جعفر رضا، ہنس راج رہبر وغیرہ کے
نام اہم ہیں لیکن جو کتابیں اور مضامین پریم چند پر لکھے گئے ہیں۔ ان سے پریم چند کی فکر و نظر اور
ادبی و فنی خصوصیات کے تجزیہ کا عمل پورا نہیں ہوتا۔ اردو میں ان کے فکر و فن اور ادبی خدمات
کے بہت سے پہلو ابھی تشنہ ہیں۔ جن پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ پیش نظر مقالہ اسی سلسلے
کی ایک کڑی ہے۔ جس میں پریم چند کے ناول (میدان عمل میں تحریک آزادی کے اثرات) کا جائزہ
لیا گیا ہے۔ کیونکہ موجودہ مقالہ ایم فل کے لئے لکھا گیا ہے اسلئے محدود بھی ہے اور مختصر بھی۔

زیر نظر مقالہ "میدان عمل میں تحریک آزادی کے اثرات" چار ابواب پر مشتمل ہے۔
پہلا باب پریم چند کے سیاسی شعور سے متعلق ہے۔ جس میں سیاسی شعور کے مفہوم کو سمجھتے
ہوئے پریم چند کے سیاسی رجحانات و میلانات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
اس طرح مصنف اور اس کی تصنیف "میدان عمل" کو سمجھنے میں مدد ملے گی جو کہ ایک سیاسی
و سماجی ناول ہے۔ دوسرا باب پریم چند کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات سے تعلق
رکھتا ہے۔ اس جائزے سے اس سماج کا تجزیہ مقصود تھا۔ جس کے پس منظر میں "میدان عمل"
لکھا گیا ہے۔ تیسرے باب کا عنوان پریم چند اور تحریک آزادی ہے۔ جس میں
پریم چند کے خطوط، ان کے مضامین اور ان پر مضامین کی مدد سے ہندوستان کی جنگ
آزادی اور طبقاتی کشمکش سے متعلق ان کے رویے کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور
یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پریم چند کے نظریہ آزادی کا مفہوم کیا تھا۔ اور وہ ہندوستان
کے لئے کیسی آزادی چاہتے تھے۔ چوتھے اور آخری باب میں پریم چند کے ناول "میدان عمل" کا تجزیاتی
مطالعہ ہے۔ اور اس تجزیاتی مطالعے سے برآمد ہونے والے نتائج پیش کئے گئے ہیں جسے ہم اپنے

مطالعہ کا ماحصل بھی کہہ سکتے ہیں ۔ آخر میں ان کتابوں کی فہرست ہے جن سے اس مقالہ کی تیاری میں براہِ راست یا بالواسطہ مدد لی گئی ہے ۔

آخر میں یہ میرا خوشگوار فرض ہے کہ میں اپنے نگراں استاد محترم ڈاکٹر نذیر احمد خاں صاحب کا شکریہ ادا کروں ۔ مقالہ کی تیاری میں شروع سے آخر تک انکی رہنمائی شامل رہی ہے ۔ یہ کام انھیں کی رہنمائی میں انجام کو پہونچا ہے ۔ انھوں نے اپنی مصروفیت کے باوجود ہمیشہ وقت دیا اور ہر قدم پر ہر ممکن میری مدد کی ۔ میں اپنے تمام دوستوں کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی اور وقتاً فوقتاً ان کا تعاون حاصل رہا ۔

محمد زکریا

۲۰ جولائی ۱۹۸۷ء ۔

باب اوّل

پریم چند کا سیاسی شعور

(۱) سیاسی شعور کا مفہوم

(۲) فنی تخلیق اور سیاسی شعور

(۳) پریم چند کے دور کے سیاسی ماحول کا پس منظر

(۴) "میدانِ عمل" میں پریم چند کا سیاسی شعور

یہ بات مسلم ہے کہ انسان ایک سیاسی ذات ہے۔ اور اس
حقیقت کو انسان کی ذات کی خصوصیات کے دائرے میں سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انسان ایک حیاتیاتی حسی اور معروضی ذات ہے۔ وہ محض جانوروں کی طرح حیاتیاتی جبلت کے دباؤ میں متحرک نہیں ہوتا بلکہ اس کا عمل حسی اور ذہنی رویہ سے عبارت ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے ماحول (جس میں معروضی و روحانی حالات شامل ہیں) کو سمجھتا اور بوجھتا ہے اور اس کے لئے وہ اپنی ذہنی خصوصیات کی مدد بھی لیتا ہے۔ شعور کا تعلق اس کی ذہنی خصوصیات سے ہے جس میں اسکی نشوونما ہوتی ہے اور اسے روحانی نفسیاتی خصوصیات یا سانچے کے ڈھرے میں رکھکر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

لیکن یہاں پر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ہوگی کہ روحانی دنیا کا اپنا کوئی الگ تھلگ وجود نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق انسان کے وجود اور اس کے حالات سے ہے۔ یعنی روحانی اور نفسیاتی دنیا افراد کے نیچرل، معروضی، سماجی اور تاریخی حالات کی رہین منت ہوتی ہے۔ یہ ان کا شعور نہیں ہے جو کہ ان کی زندگی اور حالات کا فیصلہ کرتے ہیں۔ بلکہ معروضی حقیقت اور سماجی گروہی اور تاریخی حالات ہی اس کا تعین کرتے ہیں

ارسطو کا قول ہے کہ انسان ایک سیاسی ذات ہے یہ حقیقت بھی ہے کیونکہ انسان تنہا نہیں رہ سکتا ہے۔ وہ اپنی ضرورتوں کی تکمیل و خواہشات کے لئے چھوٹے بڑے گروہوں میں زندگی

گزارتا ہے۔ یوں تو جانور بھی کیڑے مکوڑے اور پرندے بھی گروہ میں رہتے اور کام کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس انسان صرف زندہ رہنے کے لئے یا اپنے حقیقی وجود کو قائم رکھنے کے لئے زندہ نہیں رہتا ہے بلکہ انسان صاحب عقل ہے کیونکہ اس میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جس کے سہارے وہ منصوبے بناتا ہے اور یہی چیزیں اسے ایک اچھی زندگی گزارنے کے قابل بناتی ہیں۔ دراصل انسانی زندگی تہذیبوں اور تمدنوں کا پورا تانا بانا اچھی زندگی کے لئے انسان کی اسی تلاش سے عبارت ہے اور اس میں انسانی ذہنوں کی کارکردگی ہی شامل نہیں ہوتی بلکہ اس کے آس پاس کے ماحول کی تبدیلی بھی شامل ہوتی ہے۔ انسان کے تصور کی نشوونما اسی ماحول اور سماج میں ہوتی ہے۔ گویا آغاز سے انجام تک دیگر افراد یعنی والدین خاندان گروہ اور معاشرہ کے اوپر انحصار کرتا ہے۔ اسی لئے فرد اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور اس کی نفسیاتی و روحانی دنیا اس کے خاندان گروہ و معاشرہ کے حالات کے تحت تشکیل پاتی ہے۔ جس میں اس کا شعور نشوونما ہوتا ہے

لہٰذا ہمارے لئے ان کے حالات کا مطالعہ اس کے سیاسی شعور کی معرفت کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ عام طور پر سیاسی شعور فرد کی اپنی ذات گروہ اور معاشرہ کے حالات کے تئیں حسن و آگہی اور ذہنی و فکری رویہ ہے جس میں جذبات و احساسات بھی شامل ہیں اور خاص طور پر وہ سیاسی حالات اور قوتوں سے متعلق اپنے خیالات و جذبات و احساسات اور ردعمل کا اظہار ہے۔

بقول محمد مجیب ؎

"چونکہ انسانی زندگی کا تعلق ہی سیاست کے

مطالعہ کا موضوع ہے لہٰذا ایک ہوش مند انسان کے لئے بھی پولیٹیکل آئیڈیاز کا آنا فطری چیز ہے۔ کیونکہ سماج میں جو کچھ آئیڈیاز تکمیل ہوتے ہیں اس کا اثر فرد کے اوپر بھی پڑتا ہے اور اس کو وہ اپنے طریقہ سے سوچتا اور سمجھتا ہے اور ادیب و فنکار بھی اس کو اپنے اپنے طریقوں سے اس کو پیش کرتے ہیں

سماج میں رہنے والے افراد روزمرہ کی زندگی میں مختلف کردار

نبھاتے ہیں۔ اور اس کی سرگرمیاں و دلچسپیاں بھی مختلف قسم کی ہوتی ہیں جسے وہ اپنے اپنے طور پر پیش کرتا ہے اور اس کا اثر وہ اپنے گردوپیش کے ماحول سے قبول کرتا ہے جس میں اسکی ذہنی نشوونما ہوتی ہے فنکار بھی دیگر افراد کی طرح اسی ماحول کی دین ہوتا ہے اور وہ کسی نہ کسی گروہی، معاشرتی اور تاریخی صورت حال سے جڑا ہوتا ہے۔ پریم چند بھی ایک بہت بڑے ادیب تھے وہ کوئی سیاسی لیڈر یا رہنما نہیں تھے اس لئے ان کے سیاسی شعور کا مطالعہ ان کی تخلیقات کی روشنی میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس عمل میں ان کی زندگی اور اس عہد کے سیاسی حالات کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا جن کے تحت ان کے ذہنی و فکری اور سیاسی رویے کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔

فنی تخلیق اور معاشرے کے سیاسی شعور کا رشتہ بہت گہرا ہے لیکن ہمیں اس رشتے اور اس کی نوعیت و ماہیت کی پیچیدگی پر سنجیدہ نظر رکھنی ہوگی۔ کیونکہ فن پارے میں جو سیاسی شعور ملتا ہے وہ اس دور کے سیاسی و تاریخی حالات معاشرتی و تہذیبی صورت حال سے بیگانہ نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ ہر فنکار کا سیاسی شعور کسی نہ کسی طبقہ سے اپنے وجود اور اس کے حالات کے تئیں رویے و فکر و خیالات کا ترجمان ہوتا ہے جو ادبی صنف کی سطح پر نمایاں ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ خیالات تصورات اور شعور کی تشکیل کیسے ہوتی ہے اور ان کی نوعیت کیا ہے۔ سجاد ظہیر کے الفاظ میں

> "احساسات، تصورات، شعور
> علم انسانی میں سماج کی مادی زندگی اور اس سے پیدا ہونے والے
> سماجی رشتوں کے تجربوں و عمل کا عکس اور نتیجہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ
> جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مادی پیداواری عمل اور اسکا تجربہ
> انسان کے عمل کی بنیاد ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ صرف پیداواری
> عمل کے ذریعہ ہی انسان کو ہر قسم کا علم ہوتا ہے اس سے مراد یہ
> ہے کہ پیداواری اجتماعی عمل کی بنیاد پر جو معاشرہ قائم ہوتا ہے

> اور اس طرح انسانوں کے جو مختلف طبقے وجود میں آتے ہیں اور ان میں جو باہمی رشتے اور تعلقات ہوتے ہیں (یعنی جو مختلف اقسام کے اجتماعی عمل اور تعلقات اس مادی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں) سے اجتماعی طور پر انسان کے شعور اور علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ اجتماعی اور سماجی عمل انسانوں کی سیاست ان کی طبقاتی جد وجہد ان کے فنون لطیفہ اور سائنس یعنی کلچر کے مختلف مظاہر کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس طرح کے سماجی عمل اور تعلقات کی بنیاد گو مادی ہے لیکن یہ خود مادی نہیں کہے جا سکتے۔ اس طرح انسانی علم اور شعور اس تمام مادی اور غیر مادی اجتماعی عمل اور تجربہ سے پیدا ہوتا ہے۔ نئے خیالات و تصورات کے وجود میں آنے کا سبب یہ ہے کہ سماج کے مادی حالات اور ان سے پیدا ہونے والے رشتوں تقاضوں اور تضادوں یعنی ارتقا کے تقاضوں کو ان کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ طبقاتی سماج میں خیالات اور نظریوں کو ان کی طبقاتی نوعیت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہر شخص کی زندگی اس کے طبقاتی مقام سے متعین ہوتی ہے اور اس کے خیالات پر عام طور سے اپنے طبقہ کی چھاپ ہوتی ہے[۲۸]

فنکار کا سیاسی شعور ارتقا پذیر بھی ہوتا ہے اور وہ وقت اور حالات کے تحت ارتقائی مراحل سے گزرتا ہے۔ تجربہ کی روشنی میں فنکار سماجی رویہ کو امکانات سے وابستہ کرتا ہے اور وہ اپنے آئیڈیل کی تشکیل بھی کرتا ہے۔ چونکہ فنکار سماج کا ایک فرد ہوتا ہے اس لئے اس کا رشتہ سماج سے کسی نہ کسی صورت میں ضرور ہوتا ہے۔ اور ادب چونکہ انسان کے خیالات و جذبات کے اظہار کا نام ہے اور اس کے خیالات

وجذبات کی بنیاد تجربات پر ہوتی ہے اور یہ تجربے اس کی زندگی اور اس وقت کے حالات سے ہی ہوتے ہیں۔ اور ادب چونکہ خلاء میں وجود رکھنے والا کوئی عمل نہیں ہے۔ فنکار اپنی تخلیق فضا میں نہیں کرتا بلکہ اس کی تخلیق اسی سماج ماحول اور روایات سے وابستہ ہوتی ہے جس میں فنکار زندگی گزارتا ہے۔ جن حالات سے اس کی زندگی دوچار ہوتی ہے اس کے نقوش اس کی تخلیق میں ملتے ہیں۔ بقول شارب ردولوی ؎

> "فنکار کی تخلیق اسی روایت اور سماجی ماحول سے پیدا ہوتی ہے۔ جو انھیں ورثے سے ملتی ہے اور جنمیں اسکی تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔ وہ مسائل فنکاروں اور ادیبوں کو بھی درپیش ہوتے ہیں جو کسی ایک خاص عہد یا موقع پر نوع انسانی کو عام طور پر پیش ہوتے ہیں۔ اگر کسی قوم یا قوم کے بڑے حصہ میں بھوک مری غریبی افلاس یا جہالت پھیلی ہو یا اس قوم کو کسی دوسری قوم کے لوگوں نے غلام بنا لیا ہو۔ اگر وہ قوم جاہلیت لوٹ اور غارت گری کا شکار رہی ہو یا بڑے پیمانہ پر ہلاکت کا کوئی خطرہ درپیش ہو تو ظاہر ہے کہ اس قوم کے ادیبوں پر بھی ان کیفیات کا اثر پڑے گا اور ان کے فن میں اسکی جھلک ہوگی"

گویا ادب کو اس عہد کے سیاسی و سماجی حالات سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا کیونکہ جس طرح ایک عام آدمی اس عہد کے حالات سے متاثر ہوتا ہے اسی طرح فنکار بھی ان حالات سے اثر پذیر ہوتا ہے اور ادب چاہے کسی ملک کسی قوم یا کسی عہد کا ہو اس میں اس عہد کے انسانوں کے احساسات و خیالات و جذبات کا اظہار ملے گا۔ اور فنکار جس ماحول میں رہتا ہے جس سماج سے اس کا تعلق ہوتا ہے وہ ماحول اور سماج اس کی تخلیقات میں صاف طور پر ظاہر ہونگے۔

ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں ؎

"یہ صحیح ہے کہ سماج ادب کی تخلیق کے
لئے کوئی تنظیم اور منصوبہ بندی نہیں کرتا ہے اور مختلف انفرادی کوشش
ہی ادب کی تخلیق کرتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سماج
سے اسکا رشتہ نہیں ہوتا ہے بلکہ سماج کا اثر شخصیت پر اور شخصیت
کا اثر سماج پر پڑتا ہے اس لئے کوئی بھی تخلیق ان اثرات سے
الگ نہیں کیجا سکتی ہے جو سماج یا دوسرے لفظوں میں اجتماعی ہیں"[۴]

جس طرح ادیب کو سماجی زندگی سے الگ نہیں تصور کیا جا سکتا
اسی طرح اس کی تخلیق کو بھی اس عہد کے حالات سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا جو ادیب کے ذاتی تجربات و مشاہدات
کے ساتھ ساتھ ملکی زندگی سماجی نظریے اور سیاسی تنظیم کا عکس ہوتی ہے بلکہ بعض موقعوں پر تو وہ تخلیق
انھیں حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس لئے ادب کو سیاسیات سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ کیونکہ ادب
بھی اپنے زمانہ کی سیاست سے لپٹ کے کچھ لیکر چلتا ہے اور یہ فنکار کے اوپر منحصر کرتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیت
کے بابت اسے کس حد تک پیش کرتا ہے۔

پریم چند ایک بڑے ادیب تھے اور ان کی نظر زندگی اور زمانہ کے
تمام پہلوؤں پر محیط تھی۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں اس کو پوری طرح پیش کرنیکی کوشش کی ہے۔ پریم چند نے
خود اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے

"میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے
پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش
کرتا ہوں۔ مگر محض واقعہ کے اظہار کے لئے میں کہانی نہیں لکھتا ہوں
بلکہ اس میں کسی فلسفیانہ جذباتی حقیقت کا اظہار
کرنا چاہتا ہوں۔"[۵]

پریم چند کا فکری سرمایہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اپنے عہد کے حالات کو ہی پیش کیا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کیونکہ ہر ادیب اپنے وقت کے تقاضوں سے متاثر ہوتا ہے۔ جب ملک کے اندر کوئی لہر اٹھتی ہے تو ادیب کا اس سے متاثر نہ ہونا ناممکن ہے۔ چونکہ پریم چند ایک حساس ادیب تھے۔ وہ اپنے دور کے سیاسی حالات سے مطمئن نہیں تھے۔ اور انھوں نے سیاسی حالات کی بہتری کو اپنی تخلیقات میں بنیادی اہمیت دی ہے اور اپنے ذاتی خیالات کے معیار پر سیاسی نظریہ کی تشکیل کی ہے۔ پریم چند کی تخلیقات میں سیاسی ذمہ داری کی یکساں لہر دکھائی دیتی ہے۔ ان کے سیاسی شعور کے جائزے میں اس عہد کے سیاسی حالات کو سامنے رکھنا بے حد ضروری ہے۔ جنہیں ان کا شعور تشکیل پاتا ہے۔

پریم چند اس دور کی پیداوار ہیں جس وقت ہندوستانی سیاست پر برطانوی اقتدار پوری طرح قائم ہو چکا تھا اور ہندوستان کا وہ روایتی ڈھانچہ (زراعتی۔ عدالتی اور انتظامی) پوری طرح سے تغیر و تبدل ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک نئے نظام نے لے لی تھی۔ گویا پرانی قدریں ٹوٹ رہی تھیں اور نئی قدریں جنم لے رہی تھیں۔ اور ہندوستانی سماج نئے پیداواری ماحول سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ گویا برطانوی اقتدار نے ہندوستان میں ایک نئے پیداواری ماحول کو جنم دیا۔ انگریزی اقتدار نے نہ صرف ہندوستان کے سیاسی نظام میں تبدیلی پیدا کی بلکہ معاشی اور معاشرتی زندگی میں بھی نئے رشتے اور نئے نظام کی تعمیر و تشکیل کی جس کے سبب گاؤں میں زمیندار طبقے کو فروغ ملا۔ ساتھ ہی انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ بھی جدید علوم کے حصول کے بعد منظر عام پر آیا۔ جس نے خاص طور پر برطانوی اقتدار کو چلانے اسے برقرار رکھنے اور سرکاری دفتروں کو چلانے کا کام انجام دیا۔

انگریزی تہذیب مذہبی افکار و خیالات، ادب و فن اور سیاسی نظریے کے ساتھ ساتھ ایک نیا متوسط طبقہ بھی جمہوری اقدار کو لیکر سامنے آیا۔ جس نے اپنے معاشی اور سماجی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی اور جو پرانی جاگیردارانہ قدروں کو اپنے مقصد اور منزل کی رکاوٹیں تصور کرنے لگا۔ اس نے فرسودہ عقائد اور اقدار، توہم پرستی اور بے جا سماجی و مذہبی رویوں کی بھی مخالفت کی۔

پریم چند نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا اس وقت تک بہت ساری مذہبی و سماجی اصلاح کی تحریکات شروع ہو چکی تھیں۔ جس میں "راجہ رام موہن رائے" کی اصلاحی تحریک "ایشور چند ودیا ساگر" "مسز اینی بسنٹ" اور آریہ سماج کی اصلاحی تحریکیں اور مسلمانوں میں "سرسید احمد خاں" کی اصلاحی تحریک قابل ذکر ہیں۔

خاص طور پر ۱۸۵۷ کے بعد انگریزی حکومت کی گرفت ہندوستانی عوام اور سیاست پر کافی مستحکم ہو چکی تھی۔ بغاوت کے کئی سیاسی سماجی و معاشرتی اسباب تھے۔ کیونکہ انگریزوں نے ہندوستان پر اقتدار قائم ہو جانے کے بعد ہندوستانیوں کو ان کے اختیارات سے محروم کرنا شروع کر دیا تھا اور سیاسی احکامات کی پابندی کے لئے ظلم و بربریت کا سہارا لیا تھا۔ انھوں نے ہندوستانیوں کے مذہبی معاملات میں بھی دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح کے مختلف اسباب کی بنا پر ہندوستانی عوام انگریزوں کے خلاف ہو گئے تھے جس کا اظہار ۱۸۵۷ کی بغاوت کی شکل میں سامنے آیا۔ ہرچند کہ یہ کوشش ناکام رہی اور انگریزوں نے اس تحریک آزادی کو کمتر دکھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں ؎

"برطانوی مورخوں نے اس بغاوت کو فوجی بغاوت کا نام دیا ہے اس وقت کے سکریٹری "Stanlay" نے بھی برٹش پارلیمنٹ کے سامنے ۱۸۵۷ کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے اسے فوجی بغاوت کا نام دیا۔"[۵]

بہر حال جو بھی ہو ہندوستان کو برطانوی سامراجیت کے چنگل سے نکالنے کی پہلی کوشش تھی۔ جس کا اثر رفتہ رفتہ پورے ملک پر پڑا۔ اور کچھ ہی دنوں کے بعد ہندوستان کے متوسط طبقہ کے افراد نے اپنی سہولیات کے لئے انگریزی حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا اور پہلی بار "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" کے تحت ہندوستانیوں کو مرکزی مجلس قانون ساز کے تحت شامل کیا گیا مگر ان کی حیثیت صرف مشاورتی تھی۔[۶] رفتہ رفتہ ان کے مفادات اور انگریزی حکومت کے مفادات میں تضادات کی صورت حال رونما ہوئی اور آخرکار "انڈین نیشنل کانگریس" ۱۸۸۵

وجود میں آئی۔ حالانکہ اس کے قیام کے وقت انگریزوں نے یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ آنے والے وقتوں میں یہ کانگریس عوام کی خواہشات و جذبات کی آئینہ دار ہوگی۔ بعد میں اسی انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے کارناموں سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور اسی کانگریس کے پرچم تلے ہندوستان نے آزادی کی جنگ لڑی اور بالآخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوگیا۔ اسی وجہ سے "تاریخ کانگریس" کے مورخ "ڈاکٹر پی پٹابھی سیتا رامیہ" نے "کانگریس کی تاریخ کو ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ کہا ہے" ۸؎

انڈین نیشنل کانگریس کے وجود میں آنے کے بعد تقریباً بیس برسوں تک کانگریس نے ہندوستانی عوام کی رہنمائی کی اور ان کے سیاسی مسائل کے لئے جدوجہد کرتی رہی۔ اس وقت تک کانگریس کی سرگرمیاں انڈین کونسل کے خاتمے، سرکاری ملازمت میں سہولتیں، ہندوستانی فوج میں کمی اور انتظامی اصلاحات وغیرہ سے متعلق تھیں۔ جنھیں انگریزوں نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ ان دنوں کانگریس کے اجلاس میں انگریزوں کی تعریف زیادہ کیجاتی تھی۔ اس کے رہنماؤں کی تمام کوششیں سیاسی خداوندوں کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے تک محدود تھیں۔ عوام کے علاوہ خواص میں بھی انگریزوں کے انصاف پروری کی خوب مبالغہ آمیز تعریفیں کیجاتی تھیں۔ "ڈاکٹر پی پٹابھی سیتا رامیہ" نے کانگریس کی کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

> شروع شروع میں کانگریس کے حالات اس سے زیادہ اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ عوام کی شکایت کو دور کرنے کے لئے حکومت سے اپیل کرنے کے سوا اور کچھ کرے اور اسکی پالیسی بھی ہمیشہ اعتدال پر مبنی رہی ہے لیکن جلد ہی لوگوں کے رجحان میں تبدیلی ہونا شروع ہوگئی۔ اور ہندوستانی لیڈروں کے سامنے وہ چیز آگئی جس کی ہندوستان کو ضرورت تھی۔ عوام نے کانگریس کو مضبوط کرنا شروع کردیا ہر جگہ کانگریس کے نیتاؤں کی تقاریر اور کانگریس کے صدروں

کے خطبات اور کانگریس کے Resolution کی تائید ہونے
لگی۔ شروع شروع کانگریس کی تقاریر کا مطلب یہی تھا کہ
انگریز لوگ نہایت با انصاف اور صداقت پسند واقع ہوتے ہیں
اگر ان کے سامنے ہندوستان کی صداقت رکھی جائے تو وہ پیچھے
نہیں ہٹیں گے۔ کانگریس برطانوی تاج کی وفادار ہے اور وہ
صرف ہندوستان کی دفتری حکومت کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں
کی شاکی ہے۔ اور انگریزی دستور اساسی ہر جگہ ہر دلعزیز آزادیوں
کا حامل ہے۔ انگریزی پارلیمنٹ دنیا بھر میں سب سے زیادہ
Democratic Body ہے۔ اور کانگریس کوئی باغیانہ جماعت نہیں
ہے کانگریس صرف عوام کے خیالات کی ترجمانی اور حکومت کے
خیالات کو عوام تک پہونچانے کی جماعت ہے اور ہندوستانی لوگوں
کو حکومت میں مناسب حصہ دینے کے لئے انھیں پبلک سروسیز
میں زیادہ تعداد میں بھرتی کرنا چاہیئے۔ انھیں اعلیٰ تعلیم دیکر ذمہ دار
آسامیوں کے قابل بنایا جائے۔ آئین ساز کونسل میں منتخب ممبروں
کے جانے کا انتظام کیا جائے۔ فوجی اخراجات کم کئے جائیں جیوڈیشل
اور Executive کو الگ کیا جائے۔۔۔۔۔ مستقل بندوبست کو
کم کرکے مالیہ زمین کو کم کیا جائے اور ہندوستان کی صنعت و حرفت
کو ترقی دینے کی کوشش کیجائے وغیرہ وغیرہ

یہ وہ مطالبات تھے جو کانگریس نے گورنمنٹ کے سامنے رکھے تھے۔ 1915 تک کانگریس پر زیادہ
تر اعتدال پسند لیڈر ہی چھائے رہے جو کہ قانون کے دائرے میں رہ کر کام انجام دیتے تھے اور پر امن طریقہ سے سیاسی

ترقی کے خواہاں تھے۔ لیکن انھیں دنوں کانگریس کے اندر کچھ ایسے انتہا پسند لیڈر بھی سامنے آئے جو ہندوستانی عوام کے ذریعہ خود سیاسی اقدام اٹھانے اور اپنی قوت پر بھروسہ کرنے کے قائل تھے۔ یہ لوگ سیاسی و معاشی جدوجہد کی تبلیغ کرتے تھے۔ یہ رجحان رکھنے والوں کی نمائندگی۔ بال گنگا دھر تلک "بپن چندر پال" "لالہ لاجپت رائے" اور "اربندو گھوش" جیسے رہنما کر رہے تھے

۱۹۱۵ء کے بعد ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں "ہوم رول تحریک" نے بھی بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ خاص طور پر "مسز اینی بیسنٹ" اور "بال گنگا دھر تلک" نے جدوجہد آزادی کی تحریک میں ایک نئی روح پھونکی۔ ۱۹۲۰ء تک کانگریس کے دونوں بازوؤں انتہا پسند اور اعتدال پسند گروہوں میں کافی اختلافات ہو گئے جس کے باعث دسمبر ۱۹۲۲ میں "سوراج پارٹی" کا قیام عمل میں آیا۔ انگریزی حکومت اس موقع کا فائدہ اٹھا کر پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی پر برابر عمل کرتی رہی۔ ان کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکجہتی کو ختم کرنا اور قومی تحریک کو ختم کرنا تھا جس کی حکومت ہند کے چیف سکریٹری رزلے (Risley) کے اس بیان سے وضاحت ہو جاتی ہے

"متحدہ بنگال ایک طاقت ہے
بنگال اگر تقسیم ہو جائے تو اس کی طاقت منتشر ہو جائے گی۔ کانگریس
کے لیڈر بھی یہی محسوس کر رہے ہیں اور اس کے خدشات قطعاً صحیح
ہیں۔ اس اسکیم کی یہی عظیم خصوصیت ہے۔"[۱۰]

لارڈ کرزن نے بھی ۱۹۰۵ میں اسی سلسلہ میں لکھا کہ

"کلکتہ ایک ایسا مرکز ہے جہاں
سے کانگریس پارٹی بنگال میں بلکہ سارے ہندوستان میں اپنی کارروائی
چلاتی رہتی ہے۔ اس کے سدباب کے لئے کوئی ایسا قدم اٹھانا ہوگا
جو بنگلہ بولنے والوں کو تقسیم کر دے اس طرح سرگرمیوں کے دو مرکز
بن جائیں گے۔ نتیجہ کے طور پر کلکتہ کی اہمیت سازشوں کے

ایک کامیاب مرکز کی حیثیت سے باقی نہ رہے گی"۔ (۱۱)

انگریز حکومت اپنے مقصد میں بہت زیادہ کامیاب نہ ہو سکی ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام بھی عمل میں آیا جس کا مقصد مسلمانوں کے علیحدہ حقوق کی حفاظت غیر ملکی حکمراں طبقہ کے ساتھ تعاون اور ملک کے مختلف طبقوں کے بیچ ہم آہنگی پیدا کرنا تھا لیکن وہ کانگریس کی کچھ پالیسیوں کی مخالفت بھی کرتی رہی اور اپنی رجعت پسندانہ سرگرمیوں کے باعث نفرت اور نفاق پیدا کرنے کا ذریعہ بنی رہی۔ انگریزوں کی شاطرانہ چالوں کے ردعمل کے طور پر ایک انقلابی جماعت بھی پیدا ہوئی جس کا عقیدہ تھا کہ تشدد کو ختم کرنے کے لئے تشدد کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس کا طریقہ کار کانگریس سے مختلف تھا۔ اس نے اخبار و رسائل کے ذریعہ غلامی کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارے۔ نوجوانوں کو بھرتی کر کے موجودہ حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے فوج تیار کی بم اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر فوجی تربیت حاصل کی اور غیر ملکیوں کے خلاف سازشیں کر کے انھیں ختم کرنے کی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ کانگریس نے بھی اپنی طاقت بڑھالی تھی جس سے انگریزوں میں خود اعتمادی گھٹنے لگی اور انہوں نے ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ کو امرتسر کے جلیانہ والا باغ میں ایک پرامن مظاہرے پر گولیوں کی بوچھار کر دی جو کہ رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔

موہن داس کرم چند گاندھی افریقہ سے واپسی کے بعد کانگریس میں شامل ہونے کے بعد تحریک آزادی کی رہنمائی کر رہے تھے اسی بیچ کانگریس نے سوراج کی مانگ کی اسکی ابتدا مہاتما گاندھی کے عدم تعاون کی تحریک سے ہوئی۔ مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ اگر ہندوستانی عوام حق اور تشدد کی بنیاد پر ستیہ گرہ کرتے رہے تو ایک سال کے اندر انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ دینا پڑے گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا چوری چورا واقعہ کے بعد گاندھی جی نے یہ تحریک ختم کر دی۔ ہر چند کہ کانگریس کے اندر ہی اسکی مخالفت کی گئی لیکن ساتھ ہی انگریزوں کو بھی یہ گمان ہو چلا تھا کہ مہاتما گاندھی کی ہر دلعزیزی اب کم ہو چکی ہے اسلئے ان کو چھ سال کی سزا دیکر جیل میں بند کر دیا گیا۔ اسی بیچ کانگریسی رہنماؤں نے ۱۹۲۲ میں "سوراجیہ دل" کے نام سے ایک الگ پارٹی بنائی جنہوں نے کونسل کے اندر داخلہ کی تجویز پاس کی اور بہت سے کانگریس رہنما جو کہ مہاتما گاندھی سے مطمئن نہیں تھے اس میں شامل ہو گئے اور یہ جماعت زیادہ عرصہ تک متحد شکل میں سرگرم عمل نہیں رہ سکی۔

DISS
O,168,3,M80:g (V,44'N47)
168M7
TH-2207

> "پورے ملک میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی
> نظر آ رہی تھی ...... سوراجیوں میں پھوٹ پڑ چکی تھی اور فرقہ پرستی
> بھی پھل پھول رہی تھی لیکن اندر ہی اندر قومی طاقتوں میں ابال آنے
> لگا تھا۔ نومبر ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا گیا اور اس
> کے ساتھ ہی ہندوستان نے تاریکی کی چادر چاک کر ڈالی اور ایک بار
> پھر سیاسی جدوجہد کے دور کا آغاز ہوا۔" [۲۴]

سائمن کمیشن کی آمد پر اسکی شدید مخالفت کی گئی اور ملک میں ہر جگہ اس کے خلاف مظاہرے کئے گئے۔ گورنمنٹ نے ان کو کچلنے کے لئے پرامن مظاہروں پر بھی لاٹھیاں چارج کیں اور بہت سی جگہوں پر گولیاں بھی چلائیں۔ کانگریس کا لاہور اجلاس ہندوستان کی تاریخ میں بہت اہم ہے جس میں کانگریس نے تحریک آزادی کو مکمل آزادی کے نصب العین سے شروع کرنے کا اعلان کیا۔ اسی درمیان گاندھی جی نے نمک کا قانون توڑ کر تحریک عدم تعاون کی ابتدا کی۔ انگریزوں نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے تشدد اور طاقت کے تمام حربے استعمال کئے بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو "لاہور سازش" کے الزام میں سزائے موت بھی دی گئی۔ ہر چند کہ گاندھی جی بھی "بھگت سنگھ" وغیرہ کے نظریات سے بہت زیادہ مطمئن نہیں تھے پھر بھی گاندھی جی نے اس کی مخالفت کی اور سزائے موت کو قید دوامی میں تبدیل کرنے کی تجویز رکھی جسے "لارڈ ارون" نے قبول نہیں کیا۔ اسی درمیان گاندھی جی نے لارڈ ارون کے ساتھ ایک صلح نامہ پر دستخط کئے۔ جسے ہندوستان کی تاریخ میں "گاندھی ارون پیکٹ" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے مطابق تمام قیدیوں کو جیل سے رہا کر دیا گیا اور مہاتما گاندھی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے رضامند ہو گئے وہ شرکت کے لئے لندن گئے۔ مگر انگریزوں کی طرف سے انکو کوئی تعاون نہیں ملا اور وہ ہندوستان واپس آ گئے۔ اسی سال انگریزوں نے اچھوتوں کی علحدہ قومیت کا اعلان کر دیا جس کا مقصد ملک کی سالمیت کو مزید نقصان پہنچانا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں بعض اصلاحات کے ساتھ سائمن کمیشن کی رپورٹ پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ پاس ہوا۔ جسے عام طور پر ناپسند کیا گیا اسے ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے مسترد کیا آخر میں مجبور ہو کر سرکار کو اسمیں ترمیم کرنی پڑی اور کانگریس و مسلم لیگ نے انتخابات میں حصہ لیا۔

یہی وہ سیاسی حالات تھے جس وقت پریم چند نے ادبی دنیا میں قدم رکھا اور جس کے زیر اثر ان کا شعور نشو ونما پاتا ہے۔ پریم چند نے جب لکھنا شروع کیا اس وقت کانگریس دو گروپ انتہا پسند اور اعتدال پسند سورت کانفرنس کے بعد آچکے تھے اور گرم دل کی رہنمائی تلک جیسے رہنما کر رہے تھے۔ قمر رئیس کے الفاظ میں :

"اس عمر میں نواب رائے نے ان دونوں تحریکوں آریہ سماج کی اصلاحی تحریک اور "بال گنگا دھر تلک" کے گرم دل سے گہرا اثر قبول کیا۔ ان کے دل میں وطن پرستی اور جذبات کی موجیں اٹھ رہی تھیں۔ غلامی کی ذلتوں سے وہ بیزار اور برہم تھے اور اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں بھی قومی غیرت اور آزادی کی چنگاریاں روشن دیکھنا چاہتے تھے۔ "اسرار معابد" ۱۹۰۳ "ہم خرما و ہم ثواب" ۱۹۰۷ اور "کشنا" ۱۹۰۵ جیسے ابتدائی اصلاحی ناولوں میں انہوں نے ہندو سماج میں بیوہ پر ظلم اور مندروں میں مہنتوں کے ہاتھوں بھولے بھالے غریب انسانوں کا استحصال اور دوسرے لایعنی رسم و رواج کے خلاف آواز بلند کی۔ اس کے بعد انہوں نے "سوز وطن" ۱۹۰۸ میں شامل ایسے افسانے شائع کرائے۔ جو حب الوطنی اور آزادی کے جذبات سے معمور ہیں" [۳۱]

پریم چند نے اپنے ادب کا مقصد کلی حصول آزادی قرار دیا ہے۔

اور اب وہ اسی آزادی کے لئے لکھ رہے تھے اور جدوجہد کر رہے تھے۔ پنڈت بنارسی داس چترویدی کے نام ایک خط میں انہوں نے ۲۲ رجون ۱۹۳۰ کو لکھا کہ

"میری تمنائیں بہت محدود ہیں اس وقت

سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہش مند نہیں ہوں کھانے کو مل جاتا ہے دولت موٹر اور بنگلے کی مجھے پرش نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیف چھوڑ جاؤں لیکن اس کا مقصد بھی حصول آزادی ہو۔ میں بے حرکت زندگی کو بھی ناپسند کرتا ہوں ادب اور وطن کی خدمت کا مجھے ہمیشہ سے دھیان ہے"۔[۲۴]

پریم چند کی تخلیقات میں شروع سے ہی اس قسم کے خیالات نظر آتے ہیں۔ پریم چند کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" جو کہ ۱۹۰۸ میں شائع ہوا اپنے وطن کی سیاسی تحریک کو آگے بڑھانے اور جذبہ حریت کو بیدار کرنے کے الزامات میں غیر ملکی حکمرانوں کے ہاتھوں ضبط کرکے نذر آتش کر دیا جاتا ہے سوز وطن کا دیباچہ پوری توجہ کا مستحق ہے دیباچہ میں منشی پریم چند رقمطراز ہیں۔

"ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانہ کی سچی تصویر ہوتا ہے۔ جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے ہیں اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم ونثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینہ میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشہ میں متوالے ہو رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے جب قوم کے نئے و پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاح تمدن کی تدبیریں سوچی جانے لگیں اس زمانہ کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاح و تجدید کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے"

اور جب وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے ہیں
کیونکر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا یہ چند کہانیاں اس اثر
کا آغاز ہیں اور یقین ہے کہ جیوں جیوں ہمارے خیال وسیع ہوتے جائیں
گے اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے
ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن
کی عظمت کا نقشہ جمائیں۔"[۱۵]

یہیں سے پریم چند نے اپنے آپ کو وطن کی آزادی کے لئے وقف کر دیا اور یہاں تک کہ ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد ساری زندگی ملک و قوم کی خدمت میں لگے رہے۔ پریم چند کی تخلیقات کا زمانہ پریم چند کہ ۱۹۰۰ سے ۱۹۳۶ تک کی مدت پر پھیلا ہوا ہے جو کہ ہماری سیاسی زندگی میں بڑے خلفشار کا زمانہ سمجھا جاتا ہے لیکن پریم چند کے سیاسی شعور میں پختگی گہرائی اور مخصوص سمت و ہیئت کا اظہار بیسویں صدی کی تیسری دہائی کی تخلیقات میں ہوتا ہے کیونکہ اسی بیچ پہلی جنگ عظیم اور سوویت روس کے انقلاب کے بعد تحریک آزادی نے بھی ایک نیا موڑ لے لیا تھا۔ کسانوں کے احتجاج اور مزدور طبقہ کی جدوجہد نے سیاسی رہنماؤں کو عوامی مفادات اور مطالبات کی طرف متوجہ کیا۔ ان پر یہ حقیقت عیاں ہو چکی تھی کہ کسانوں مزدوروں اور عوام الناس کی حصہ داری کے بغیر تحریک کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا ڈاکٹر قمر رئیس نے اس صورت حال کا مختصراً ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

"پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد
ہندوستان میں جو تحریکیں اٹھیں اگرچہ ان کی قیادت متوسط طبقہ
کے ہاتھوں میں رہی۔ لیکن اس کی تنظیم اور عملی سرگرمیاں عوام
کے تعاون کی آئینہ دار ہیں۔ اس طرح سیاسی و قومی تحریکوں
میں پہلی بار ہندوستان کے عوام کو نمائندگی اور حق کا موقع ملا تھا
اب متوسط طبقہ کے رہنماؤں کو یہ احساس ہو گیا کہ قومی تحریکوں

کو کامیاب بنانے کے لئے اگر محنت کش طبقہ کا تعاون ناگزیر ہے
تو یہ ضروری ہے کہ ان کی زندگی کے بنیادی مسائل کو سمجھنے اور حل
کرنے کی کوشش کی جائے۔ مہاتما گاندھی نے ہندوستان کی سیاست
میں قدم رکھتے ہی اس کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا چنانچہ انھوں نے سب
سے پہلے ہندوستان کے کسانوں کی زندگی کا مطالعہ کیا اور جہاں ضرورت
ہوئی ان جماعتوں اور قوتوں کے خلاف بڑے استقلال سے مورچہ
قائم کیا جو کسانوں کو جبر و ظلم کی چکی میں پیس رہی تھیں۔" [۱۶]

پریم چند نے اس دور میں خاص طور سے کسانوں کی زندگی کے مسائل اور موضوعات کو اپنی تحریروں کا مرکزی موضوع بنایا کیونکہ پریم چند اس سے بالکل مطمئن نہیں تھے کیونکہ کسانوں اور مزدوروں کو محنت و مشقت کے باوجود دو وقت کی روٹی میسر نہیں ہوتی تھی۔ پریم چند ان حالات کو بدلنا چاہتے تھے اور وہ پوری زندگی اس کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ پریم چند نظریات کے اعتبار سے کئی مراحل سے گزرے ہیں ابتدائی دور میں وہ آریہ سماج کی اصلاحی تحریک سے متاثر رہے اور اپنی تخلیقات میں مذہبی و سماجی اصلاح کو ہی موضوع بنایا اور پھر ۱۹۲۲ میں سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد گاندھی جی کے ساتھ عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اور "میدان عمل" جو کہ ۱۹۳۰ اور ۱۹۳۲ کے درمیان لکھی گئی تھی نظریاتی اعتبار سے بہت اہم ہے اس ناول میں پہلی مرتبہ طبقاتی مفادات مزدور اور کسانوں کی جدوجہد فرقہ واریت چھوا چھوت اور انگریزی حکومت کے مظالم کا واضح شعور ملتا ہے [۱۸]

یہ ناول اس وقت لکھا گیا جب ہندوستان میں سیاسی کشمکش زیادہ شدید صورت اختیار کر چکی تھی۔

سیاسی ہیجان کی پوری فضا "میدان عمل" میں نظر آتی ہے نہ صرف سیاسی فضا بلکہ معاشی اور سماجی صورت حال بھی پورے فنکارانہ سلیقہ سے پیش کئے گئے ہیں ڈاکٹر قمر رئیس میدان عمل کے کرداروں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"میدان عمل کے تمام کردار عمل کے
سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں اور ان کے عمل کا مقصد مزدور اور کسانوں کو

جبر و استحصال کی قوتوں کے خلاف متحد کرنا انھیں اپنے حقوق کا
احساس دلانا اور ان کے اندر طبقاتی مفاد کا ایک واضح شعور
پیدا کرنا اور انھیں اپنی بہتری کے لئے عملی جدوجہد کا راستہ دکھانا ہے
اور ساتھ ہی محنت کش طبقہ کے مسائل سے جس گہری ہمدردی
کا اظہار کرتے ہیں وہ ان کی حقیقت نگاری کے ایک
نکھرے ہوئے تصور کو سامنے لاتا ہے"[19]

اس ناول میں ہمارے سامنے کرداروں کا ایک سلسلہ گزرتا ہے اور ان کرداروں کو پریم چند نے جس فنکارانہ سلیقہ سے پیش کیا ہے اسکی مثال ان کے دوسرے ناولوں میں نہیں ملتی۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ انکے کرداروں میں بھی تبدیلی آتی ہے مثلاً نئی سکینہ اور سمرکانت کو حالات نے کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔ لالہ سمرکانت جو کہ ساہوکار اور دولت مند تاجر ہے جو کہ صرف دولت کا خواہشمند ہوتا ہے اور خود بھی اپنے لڑکے امرکانت کو کاروبار میں ہی پھنسانا چاہتا ہے۔ لیکن سکھدا اور امرکانت کی گرفتاری کے بعد سمرکانت خود تحریک آزادی میں شامل ہوتے ہیں ہڑتال کا نعرہ لگاتے ہوئے لالہ سمرکانت نے موجودہ حالات کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے۔

"ہاں ہڑتال ضروری ہوگی مگر ایک
دو دن کے لئے نہیں یہ ہڑتال اس وقت تک جاری رہے گی جبتک
ہمارے حاکم ہماری آوازیں نہیں سن لیتے۔ ہم مفلس اور کنگال ہیں
بے سہارا ہیں اور غموں کے مارے ہیں مگر یہ بڑے لوگ ٹھنڈے دل
سے سوچ سکتے تو ان کو نظر آجاتا کہ ان کو بڑا آدمی ان غریبوں نے
ہی بنایا ہے۔ یہ عالی شان محل بنانے میں کس نے اپنی جان جوکھم
میں ڈالی۔ یہ کیڑا ملیں کون چلا رہا ہے۔ ان کے دروازوں پر روز

صبح دودھ کون پہونچاتا ہے۔ صفائی کون کرتا ہے اور ان کے گندے
کپڑے کون دھوتا ہے۔ ہر صبح ان کی ڈاک اور اخبار کون پہونچاتا ہے
شہر کی تین چوتھائی آبادی ایک چوتھائی کے آرام کے لئے ہر وقت
اپنا خون پسینہ ایک کر رہی ہے۔" ۱۵

لالہ سمر کانت ان لوگوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جنھوں نے ان کی زندگی کو برباد کر رکھا ہے۔ اور وہ مل مالک سرمایہ دار اور زمیندار طبقہ جنھوں نے ہندوستان کی عوام کو غلام بنا رکھا ہے ہر طرح سے ان کا استحصال کر رہے ہیں۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جب تک یہ طبقے اور نظام ختم نہیں ہو جاتے اس وقت تک ملک کی اجتماعی خوشحالی آزادی اتحاد اور ملکی سالمیت کا خواب پورا نہیں ہو سکتا ہے

میدان عمل میں پریم چند نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہندوستان کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ "منی" کا مقدمہ بھی اپنے اندر بڑی رمزیت رکھتا ہے اس مقدمہ میں پریم چند انگریزوں اور انگریزی حکومت سے جو نفرت ہندوستانیوں کے دل میں تھی اس کو بڑی خوبی کے ساتھ سامنے لاتے ہیں اس سے ہمیں پریم چند کے شعور کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اور خاص طور پر انگریزوں کے دل میں ہندوستانی عوام کی کیا عزت تھی یہ چیز پورے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ 'منی' کی عصمت دری چند انگریز کرتے ہیں اور 'منی' انتقامی جنون میں انگریز کو قتل بھی کر دیتی ہے اور منی پر "قتل کا مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں سارے شہر میں جو افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ اس کو پریم چند نے کچھ اسطرح بیان کیا ہے۔

"تین مہینہ تک سارے شہر میں
تلاطم برپا رہا۔ روز ہزاروں لوگ سب کام دھندے چھوڑ کر کچہری
کا چکر لگاتے۔ بھکارن کو ایک نظر دیکھ لینے کا اشتیاق ہر ایک
کے دل میں تھا۔ عورتوں کی بھی خاصی تعداد جمع ہو جاتی تھی
اور بھکارن جوں ہی لاری سے اترتی فلک بوس نعرے

بلند ہو جاتے اور پھولوں کی بارش ہونے لگتی ہے"۔ (۲۱)

یہاں پر پریم چند نے نہ صرف ہندوستانیوں کے غم و غصہ اور نفرت کو پیش کیا ہے بلکہ اس واقعہ کے ذریعہ انھوں نے مختلف مکتبہ خیال کے کرداروں کو "منی" کے مقدمہ سے اتفاق کرتے دکھایا ہے۔ ہر کردار منی کے اقدام کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ سمر کانت جو کہ دولت کے پجاری اور انتہائی خودغرض انسان ہیں وہ بھی منی کے معاملہ میں امر کانت سے اختلاف نہیں کرتے ہیں۔ سکھدا جو امر کانت کی بیوی اور دولت مند باپ کی بیٹی ہے وہ بھی منی کی کامیابی کے لئے جد و جہد کرتی ہے۔ "سکھدا" امر کانت سے کہتی ہے

"اگر اسے پھانسی ہو گئی تو میں
سمجھوں گی کہ دنیا سے انصاف اٹھ گیا اس نے کوئی جرم نہیں کیا
ہے جن بدذاتوں نے اس پر اتنا بڑا ظلم کیا ہے انھیں یہی سزا
ملنی چاہئے۔ میں اگر عدالت کی کرسی پر ہوتی تو اسے بے داغ
چھوڑ دیتی۔ ایسی دیوی کی تو پوجا کرنی چاہئے۔ اس نے اپنی ساری
بہنوں کا سر اونچا کر دیا۔" (۲۲)

"سلیم" جو کہ خود بھی "منی" کی کامیابی کے لئے جد و جہد کرتا ہے۔ "سکھدا" کی ماں "رانادیوی" بھی منی کی کامیابی کے لئے کوشاں ہے۔ سکینہ اور بوڑھی پٹھانی جو کہ بہت زیادہ مفلس ہیں ان کو بھی منی کے مقدمہ کے لئے چندہ دیتے دکھایا گیا ہے۔ دراصل ان کرداروں کو ایک جگہ لاکر کھڑا کرنا بہت اہم کارنامہ ہے۔ جو پریم چند کی انگریزوں سے نفرت کا غماز ہے۔

پریم چند اچھوتوں کے مسائل، سماج میں پھیلے ہوئے ذات پات کے جھگڑے و فرسودہ روایات اور سماج کی طبقہ وارانہ تقسیم کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا وہ دائمی حل چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں اچھوتوں کی خوشحالی اور سماج میں ان کو برابری کا مقام دلانے کی وہ ہمیشہ کوشش کرتے رہے اس مسائل کو میدان عمل میں انھوں نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس برائی کی

جڑیں صرف رسم و رواج تک نہیں پھیلی ہوئی ہیں بلکہ ملک کے معاشی و معاشرتی نظام میں بھی پیوست ہیں۔ جسے بڑے فنکارانہ طریقہ سے انھوں نے میدان عمل میں پیش کیا ہے۔

پریم چند کا قلم ہمیشہ غریب النسالوں کے مسائل کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ آپ کو ہندوستان میں پھیلی ہوئی چھوت چھات کی بیماری اور ذات پات کے جھگڑوں سے سخت نفرت تھی۔ نچلے طبقوں کے مندر میں داخلہ کی پابندی کے وہ سخت خلاف تھے۔ یہاں تک کہ انھیں بھگوان کے درشن کرنے کا بھی حق نہیں تھا۔ "میدان عمل" میں انھوں نے مذہبی رہنماؤں کے رویہ کو نچلے طبقے کے لوگوں کے ساتھ کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے

"آپ لوگوں نے ہاتھ کیوں بند کر لئے
لگائیے خوب کس کس کر اور جوتوں سے کیا ہوتا ہے۔ بندوقیں منگائیے
اور ان بے دھرموں کا خاتمہ کر دیجئے۔ اور تم دھرم کو ناپاک کرنے
والے تم سب بیٹھ جاؤ۔ اور جتنے جوتے کھا سکو کھاؤ۔ تمہیں اتنی بھی
خبر نہیں کہ یہاں پر سیٹھ اور مہاجنوں کے بھگوان رہتے ہیں۔ یہ بھگوان
جواہرات کے زیور پہنتے ہیں۔ موہن بھوگ اور بھلائی کھاتے ہیں چیتھڑے
پہننے والوں اور ستو کھانے والوں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے۔"[۲۳]

میدان عمل میں پریم چند نے ہندوستان کے ہریجنوں کے مسائل کو بڑی شدت سے پیش کیا ہے ان کی زندگی کے حالات ان کے ساتھ اونچی ذات والوں کے برتاؤ بیگاری کے مسئلے اور اچھوتوں پر ہونے والے مظالم وغیرہ کو انھوں نے بڑی فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی عورت کی زندگی کے مسائل بھی پریم چند کے پیش نظر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر منی کے کردار کو لیجئے۔ منی ایک باوفا بیوی کی شکل میں سامنے آتی ہے مگر عصمت دری کے بعد گاؤں چھوڑ کر اچھوتوں کی بستی میں پناہ لیتی ہے۔ ذیل میں اس کے ذہنی کرب کو دیکھئے۔

"میں بے کس اور مصیبت زدہ عورت

ہوں۔ مجھے اتنا ہی یاد ہے کہ کئی مہینہ پہلے میری سب سے عزیز چیز
لٹ گئی اور اب میرا جینا بیکار ہے۔ میں تو اسی دن مر چکی
میں آپ کے سامنے کھڑی بول رہی ہوں۔ لیکن اس جسم میں
جان نہیں ہے۔ اسے میں زندہ نہیں کہتی جو کسی کو اپنا منہ
نہ دکھا سکے۔"[۲۴]

منی عدالت میں یہ بیان دیتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حقیقی زندگی سے کتنی نفرت کرنے لگتی ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ انگریز۔ جس کے ہاتھوں اس کی عصمت ریزی ہوتی ہے۔ یہاں پریم چند یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انگریز نہ صرف ہماری معاشی بدحالی کے ذمہ دار ہیں بلکہ ان کے ذریعہ ہماری بہو بیٹیوں کی عزت و آبرو بھی محفوظ نہیں ہے۔

پریم چند قوم کو تعلیم سے روشناس کرانا چاہتے تھے کیونکہ وہ یہ سوچتے تھے کہ بغیر تعلیم کے قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ قوم کی پستی کی وجہ صرف معاشی بدحالی نہیں ہے۔ کیونکہ تعلیم کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بغیر تعلیم کے سماجی شعور بیدار نہیں ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں تعلیم کو عام کرنے کے لئے وہ قومی تعلیم گاہوں کی حمایت کرتے ہیں لیکن انگریزی طرز تعلیم سے مطمئن نہیں تھے ایک جگہ وہ لکھتے ہیں

"ہماری تعلیم گاہوں میں جتنی سختی سے
فیس وصول کیجاتی ہے۔ اتنی سختی سے شاید کاشتکاروں سے مالگذاری
بھی نہیں وصول کیجاتی ہے۔ مہینہ میں ایک دن وصولی کے لئے متعین کر دیا
جاتا ہے۔ اس دن فیس کا داخل ہو جانا لازمی ہے یا تو فیس دیجئے
یا نام کٹوائیے۔ یا جب تک فیس نہ دیجئے روز کچھ جرمانہ دیجئے
۔۔۔۔۔۔ ایسے جابرانہ قواعد کا مقصد اس کے سوائے اور کیا ہو سکتا ہے
کہ غریبوں کے لئے مدرسہ کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔"[۲۵]

پریم چند نے "میدان عمل" میں اس زمانہ کے ہندوستان کی ہیجانی و اضطراری حالت کو بیان پیش کیا ہے۔ دیہات اور شہروں میں ہر جگہ ہڑتال ہوتی دکھائی گئی ہے۔ لگان کے خلاف احتجاج بھی ہوتا ہے حکومت اور سرمایہ دار متحد ہو کر اس کو روکنے کے لئے گولیاں بھی چلاتے ہیں۔ گرفتاریاں بھی ہوتی ہیں اس کے باوجود یہ شورش روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اور عوام متحد ہو کر اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں بقول یوسف سرمست ؎

"پریم چند نے ہر جگہ میدان عمل میں
اجتماعی جدوجہد کو پیش کیا ہے اور اس میں متوسط طبقہ کے نوجوانوں
کاشتکاروں مزدوروں اور دوسرے تمام افراد کی قومی جدوجہد کو
پوری فنکارانہ طریقہ سے پیش کیا گیا ہے۔"[۲۶]

"میدان عمل" میں جو جدوجہد پیش کی گئی ہے اس میں محنت کش اور مزدور طبقہ کو خاص طور پر ابھارا گیا ہے۔ کیونکہ مزدور متحد ہو کر اپنے حقوق کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اور اس وقت تک بہت سی مزدور اور کسان تنظیمیں وجود میں آچکی تھیں۔ پریم چند کو خود بھی کسان اور مزدوروں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ شیورانی دیوی لکھتی ہیں کہ "کانگریس کے سیاسی پروگراموں میں کاشتکاروں کو شریک کرنے کے لئے پریم چند دیہاتوں کا دورہ کیا کرتے تھے" اور پریم چند غریبوں کی مصیبت اور حکومت کے بیجا ظلم کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ وہ پوری شدت سے سیاسی جدوجہد میں شریک ہو کر اپنی گرفتاری کے لئے بھی آمادہ تھے اور یہی وجہ ہے کہ "میدان عمل" میں ہر جگہ سرکار سے نفرت کا اظہار ملتا ہے۔ ہندوستان میں اس وقت آزادی کے لئے جو شدید جدوجہد جاری تھی اسے بھی میدان عمل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ سکھدا اپنی گرفتاری کے وارنٹ کو دیکھ کر کہتی ہے ؎

"جس قوم کی بنیاد پیر بے انصافی پر ہو۔
اسکی سرکار کے پاس سختی کے سوا اور کیا دوا ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے
کوئی یہ نہیں سمجھے کہ یہ تحریک فرو ہو جائے گی۔ اسی طرح جیسے کوئی گیند
ٹکرا کر دوگنے تیز سے اچھلتی ہے اتنا ہی اسکا جواب بھی زوردار ہوگا۔۔۔

..... مجھے گرفتار کرلیں۔ ان لاکھوں غریبوں کو کہاں لے جائیں گے
جنکی آہوں کا دھواں بادل بنکر آسمان پر چھایا ہوا ہے۔ یہی آہیں ایک
دن کسی آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹکر ساری قوم اور قوم کے ساتھ
سرکار کو بھی غارت کردے گی۔"[۲۸]

اس ناول میں گاندھی جی کے اثر کی چھاپ بھی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ عدم تشدد پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ مگر ساتھ ہی ایک باغیانہ رجحان بھی ہے جو کسی حالت میں مصالحت پر رضا مند نہیں ہوتا۔ اس ناول میں ایک اور اہم چیز یہ ہے کہ پریم چند نے بے شمار ہندو اور مسلم کردار پیش کرکے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے یہ چیز ابھر کر سامنے آتی ہے کہ پریم چند کے اندر یہ جذبہ کس قدر کارفرما تھا اور یہ دکھایا ہے کہ ہندو مسلم کس طرح ایک دوسرے کے زندگی سے ہم آہنگ تھے اور بلا امتیاز مذہب و ملت کس طرح اپنے ملک اور اپنے ہم وطنوں کی فلاح و بہبود اور آزادی کے لئے جذبہ ایثار رکھتے تھے۔ ان تمام حالات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ پریم چند نے "میدان عمل" میں اپنے عہد کی سیاسی سماجی و معاشی حالت کو بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے

غرض پریم چند کے یہاں ایسے بے جا مذہبی و سماجی رسم و رواج جو ہندوستانی معاشرے اور انسان کی فلاح و بہبود میں حائل ہوتے ہیں انکے خلاف محاذ آرائی اور احتجاج کا رویہ ملتا ہے ان کی تحریر میں ستیہ اور اہنسا کے اصول کے تحت سماج کی تشکیل نو معاشی اور اخلاقی استحصال سے پاک صاف غیر طبقاتی معاشرے کی آرزوں تمناؤں اور خواہشات کا سفر نظر آتا ہے ان کے سیاسی شعور میں انسان دوستی۔ قومی یکجہتی۔ معاشی مساوات۔ طبقاتی ہم آہنگی مذہبی تہذیبی اور سیاسی آزادی کی چاشنی گھلی ہوئی ہے۔ فرقہ پرستی۔ سرمایہ داری۔ جاگیرداری۔ غلامی۔ تعصب۔ تنگ نظری رجعت پسندی مذہبی کٹرپن۔ فرسودہ معاشرہ و مذہبی رسومات کے سخت مخالف ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد مجیب - تاریخ فلسفہ سیاسیات - ص - ۱۳

۲۔ سجاد ظہیر - روشنائی - ص - ۷۰ - ۷۱

۳۔ شارب ردولوی - جدید اردو تنقید اصول و نظریات - ص - ۳۳/۳۲

۴۔ شارب ردولوی، جدید اردو تنقید اصول و نظریات - ص - ۴۰

۵۔ ہنس راج رہبر - پریم چند - ص - ۱۷۵

۶۔ ڈاکٹر تارا چند - تاریخ تحریک آزادی ہند - ص ۳۵۷

۷۔ منو رنجن جھا - جدوجہد آزادی میں مرکزی مجلس قانون ساز کا رول - ص - ۱۷

۸۔ ڈاکٹر بی. پٹا. بھائی سیتا رامیہ - تواریخ کانگریس - ص ۶

۹۔ ڈاکٹر بی. پٹا. بھائی سیتا رامیہ - تواریخ کانگریس - ص ۱۹۵

۱۰۔ بپن چندرا - جدید ہندوستان - ص - ۲۵۱

۱۱۔ بپن چندرا - جدید ہندوستان - ص - ۲۵۱

۱۲۔ بپن چندرا - جدید ہندوستان - ص - ۲۹۰

۱۳۔ قمر رئیس - پریم چند فکر و فن - ص - ۱۵

۱۴۔ مدن گوپال - مرتب - پریم چند کے خطوط - ص ۲۷۵

۱۵۔ وقار عظیم - مضمون - پریم چند کے افسانوں کا پہلا مجموعہ - پریم چند شخصیت اور کارنامے - مرتب ڈاکٹر قمر رئیس - ص - ۱۳۳

۱۶۔ قمر رئیس - پریم چند کا تنقیدی مطالعہ - ص ۱۹۲

۱۷۔ قمر رئیس - پریم چند کا تنقیدی مطالعہ - ص - ۲۸۳

۱۸۔ یوسف سرمست - بیسویں صدی میں اردو ناول - ص - ۱۹۰

۱۹۔ قمر رئیس - پریم چند کا تنقیدی مطالعہ - ص - ۳۸۱

۲۰؎ پریم چند۔ میدانِ عمل۔ ص۔ ۳۷۵

۲۱؎ پریم چند۔ میدانِ عمل۔ ص۔ ۷۵

۲۲؎ پریم چند۔ میدانِ عمل۔ ص۔ ۴۷

۲۳؎ پریم چند۔ میدانِ عمل۔ ص۔ ۲۳۲

۲۴؎ پریم چند۔ میدانِ عمل۔ ص۔ ۸۰

۲۵؎ پریم چند۔ میدانِ عمل۔ ص۔ ۵

۲۶؎ یوسف سرمست۔ بیسویں صدی میں اردو ناول۔ ص۔ ۲۰۱

۲۷؎ شیو رانی دیوی۔ پریم چند گھر میں۔ ص۔ ۱۵۷

۲۸؎ پریم چند۔ میدانِ عمل۔ ص۔ ۳۷۴

باب دوم

پریم چند کا عہد: سیاسی و سماجی صورتِ حال

(۱) راجہ رام موہن رائے اور انکی سماجی اصلاحیں

(۲) ہندوستان میں مختلف مذہبی اور سماجی تحریکیں

(۳) سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک

(۴) آریہ سماج تحریک اور پریم چند

(۵) ترقی پسند تحریک اور پریم چند

پریم چند کے عہد کے سیاسی و سماجی پس منظر

کا تعلق ہندوستان کی تاریخ کے اس دور سے ہے۔ جب ہندوستانی سیاست اور معاشرہ پر برطانوی نوآبادی نظام کا تسلط و تصرف پوری طرح قائم ہو چکا تھا۔ اور جس سے یہاں کی سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی تغیر و تبدل سے دو چار ہوئی۔ ۱۸۵۷ کے بعد ہندوستانی سیاست پر برطانوی نوآبادیاتی نظام کی گرفت اور بھی زیادہ مستحکم اور مضبوط ہو جاتی ہے اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں پر بھی انگریزوں کا تسلط و تصرف قائم ہو جاتا ہے۔ انگریزی دور حکومت میں صرف سیاسی اقتدار ہی غیر ملکی حکمرانوں کے ہاتھ میں نہیں آیا بلکہ یہاں کی معاشی و معاشرتی زندگی میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ معاشی اور معاشرتی رشتے بھی بدلے اور عدالتی و انتظامی سانچہ بھی تبدیل ہوا۔ گاؤں کی خود مختار معاشی زندگی بھی تہہ و بالا ہوئی اور دیسی صنعتیں کرگھے اور چرخے بھی برباد ہوئے۔ ریلوے لائنوں اور ٹیلی فون کے تاروں کا جال ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیل گیا۔ سمندر میں کشتیوں کی جگہ کوئلے سے چلنے والے بڑے بڑے جہازوں نے لی۔ اور ہندوستانی بازاروں میں برطانوی کارخانوں کی بنی ہوئی اشیاء دیسی سامانوں کے کھپت کے مواقع رفتہ رفتہ کم کر دیے۔ گاؤں میں جاگیردار اور جاگیردار سے زمین لیکر کام کرنے والے چھوٹے بڑے کسان۔ کھیت مزدور و سود خور اور بنئے پیدا ہوئے۔ شہروں میں بورژوازی طبقہ دلال۔ سود خور، سوداگر اور نیا متوسط طبقہ

(سرکاری اور غیر سرکاری) صنعت کار اور مزدور پیدا ہوئے۔

قرون وسطیٰ کے تعلیمی نظام کی جگہ اب انگریزی تعلیم کی ضرورت اور افادیت بڑھ گئی اور مغربی علوم و فنون افکار و خیالات ادب و فلسفہ، جمہوری اقدار اور تعلیم سے افراد روشناس ہوئے۔ مذہبی و سماجی اصلاح و احیاء کی تحریکیں وجود میں آئیں۔

انڈین نیشنل کانگریس (۱۸۸۵) کا قیام عمل میں آیا۔ ہندوستانی متوسط طبقہ نے اپنی فلاح و بہبود کے لئے مذہبی و معاشرتی اصلاح کی تحریکوں سے سیاسی تحریک کی طرف رخ کیا۔ رفتہ رفتہ معاشرہ کے پسماندہ طبقوں نے اپنی مفلوک الحالی و پسماندگی اور بدتر معاشی و معاشرتی زندگی سے نجات حاصل کرنے کے لئے خود کو منظم و متحد کرنا شروع کر دیا۔ اسی دور میں پہلی جنگ عظیم اور سوویت روس میں اکتوبر انقلاب آیا۔ اور روس میں لینن کی قیادت میں انسانی تاریخ ایک نئے معاشرہ کی تشکیل کرنے لگی جو معاشی و معاشرتی استحصال سے آزاد تھا۔ ہندوستان کے محنت کش عوام مزدور اور کسانوں نے ۱۹۲۵ میں "ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی" قائم کی اور ۱۹۳۶ تک ہندوستان کے طالب علموں، فنکاروں اور ادیبوں نے بھی اپنی اپنی تنظیموں کی تشکیل شروع کر دی۔ یعنی "انجمن ترقی پسند مصنفین" اور "آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن" کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ہندوستانی کسانوں نے بھی ایک انجمن "آل انڈیا کسان سبھا" کے نام سے قائم کی۔ اس وقت تک ملک میں کسانوں، مزدوروں، طالب علموں آدی باسیوں اور فوجیوں نے بھی تحریکیں چلائیں اور کچھ نے تو انتہا پسند اقدامات کے ذریعہ بھی انگریزوں کی مخالفت کی جنھیں انگریزی حکومت نے کچلنے کے لئے نہایت سخت اقدامات اٹھائے۔ گاندھی جی بھی اب کانگریس میں شامل ہو چکے تھے اور ان کے اور کانگریس کی رہنمائی میں سیاسی تحریک مختلف مراحل سے گزر رہی تھی۔ اب ہم مختصراً ان سیاسی و سماجی صورت حال اور تحریکات کا جائزہ لیں گے۔ جس کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق پریم چند کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

سماجی و مذہبی اصلاح کی تحریکیں سب سے پہلے

مشرقی ہندوستان (بنگال۔ اڑیسہ۔ مشرقی بہار) میں شروع ہوئیں جہاں پر برطانوی اقتدار سب سے پہلے قائم ہوا اور جس سے یہاں کے لوگ براہِ راست متاثر ہوئے تھے۔ مختلف سیاسی و سماجی اصلاح کی تحریکیں اسی علاقہ سے اٹھکر ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیلتی ہیں۔ یہیں سے راجہ رام موہن رائے جیسے انسان نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا۔ بقول عبداللہ یوسف علی :

"بنگال پہلا صوبہ ہے
جہاں پر برطانوی اثر پورے طور پر پھیلا۔ دوسرے صوبے
ابھی بیدار بھی نہیں ہوئے تھے کہ بنگال میں انگریزی تعلیم
بڑی تیزی سے ترقی کرنے لگی تھی اور بنگالیوں کے
اثر پذیر دماغ بہت تیزی سے اثر قبول کرکے ترقی کرنے
لگے تھے"۔ ۱

برطانوی فتوحات کے اثرات رفتہ رفتہ پورے

ہندوستان پر پڑے۔ انھیں اثرات کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کی عوام نے سماج کو سدھارنے اور جدید بنانے کی بنیاد رکھنے کے لئے اپنے سماج کا بغور جائزہ لینا شروع کردیا۔ اور انیسویں صدی کے دوران کئی اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں۔ اور ان تحریکوں نے وطن پرستی کے جذبہ کی نشو ونما اور ملک کی آزادی اور سماج کی تعمیرنو کے مقاصد حامل تحریکوں کے لئے بھی راہ ہموار کی۔ اس تحریک میں راجہ رام موہن رائے مرکزی شخصیت کے مالک تھے جنھیں جدید ہندوستان کا معمار کہا گیا ہے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ ستی کی رسم کے خلاف محاذ آرا ہونا اور حکومت سے اس کو ممنوع قرار دلوانا ہے۔ اور ساتھ ہی انھوں نے معاشرہ میں عورت اور بیوہ کی حالت کو سدھارنے اور فرسودہ سماجی و مذہبی رسم و رواج کو ترک کرنے کی ترغیب دی اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا۔

"راجہ رام موہن رائے نے
اصلاحی مقاصد کی تکمیل کے لئے ۱۸۲۸ء میں "برہمو سماج"
کی بنیاد ڈالی اور مذہبی تعطل قدامت پسندی اور تنگ
نظری کو ختم کرنے کی کوشش کی وہ عقلی اور سائنسی
طرز فکر اور انسانی وقار کے اصول اور سماجی مساوات
کو اپنے مشن کی بنیاد سمجھتے تھے"۔

راجہ رام موہن رائے نے مختلف دیوتاؤں کی پرستش اور مورتی پوجا کی مذمت کی اور نیز سبھی مذہبوں اور انسانیت کے لئے ایک خدا کا پرچار کیا۔ انھوں نے مذہب کے تئیں عقلی انداز فکر اختیار کرنے پر زور دیا اور لوگوں کو مذہبی کتابوں کے مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کی اس تحریک کا اثر خاص طور پر نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ پر بہت زیادہ پڑا اور سماج کی سرگرمیوں میں عملی طور پر لوگوں نے حصہ بھی لیا۔ انھوں نے مذہبی سدھار کے علاوہ سماجی اصلاحات کی طرف بھی توجہ کی۔ اور سماج میں پھیلے ذات پات کے نظام کو غیر انسانی قرار دیکر اس کی بنیادوں پر حملہ کیا۔ انھوں نے بچپن کی شادی کو بھی ختم کرنے کی مہم چلائی۔ اور عورتوں کو مساوی حقوق دلانے'' بیواؤں کی دوسری شادی کرنے نیز جائداد پر بھی عورتوں کے حقوق کی وکالت کی۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ستی کی رسم ختم کرانے کے لئے 'لارڈ ولیم بنٹنک' کے عہد میں ایک قرار داد پیش کی گئی جس کو قانونی شکل ملی۔ عبداللہ یوسف علی لکھتے ہیں کہ

"راجہ رام موہن رائے کی
کوششوں کا نتیجہ تھا کہ لارڈ ولیم بنٹنک نے ۴ دسمبر ۱۹۲۹ کو ستی
کی مخالفت کا قانون منظور کر لیا۔ اس کی رو سے بیوہ کو جلانا
یا زندہ دفن کرنا (یعنی ستی کی ہر صورت) خلاف قانون اور
فوجداری عدالتوں میں قابل سزا قرار دیا گیا"۔

ہر چند کہ "راجہ رام موہن رائے کو سماج کے کچھ قدامت پسند لوگوں کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن وہ اس کی فکر نہ کرتے ہوئے اپنی اصلاحی تحریک کو لیکر آگے بڑھتے رہے۔ وہ جدید تعلیم کے بھی حامی تھے۔ ان کی کوششوں کے نتیجہ میں ہی" ہندو کالج" کا قیام عمل میں آیا۔ انھوں نے جدید تعلیم کو متعارف کرانے کے لئے لارڈ میکالے کی بھی حمایت کی۔ بعد کے وقتوں میں تو آپ نے اپنی تمام تر کوششیں جدید علوم حاصل کرنے اور ہندوستانی سماج کو جدید بنانے کی طرف صرف کر دیں

"آپ نے جدید علوم کے مقصد کے تحت ویدانت کالج قائم کیا جس میں ہندوستانی علوم کے علاوہ مغربی سماجیات اور طبیعاتی علوم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی" ۲

راجہ رام موہن رائے کی قائم کردہ تنظیم "برہمو سماج" ہندو سماج کو نئے سرے سے تشکیل دینے اور سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے کی پہلی کوشش تھی۔ انھوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اسے بعد میں "دیویندر ناتھ ٹیگور" اور "کیشب چندر سین" جیسے روشن خیال شخصیتوں نے پورے ملک میں پھیلایا۔ ملک کے مختلف حصوں میں اس تنظیم کی شاخیں قائم ہوئیں جس کے ذریعہ بعض اہم سماجی اصلاحات عمل میں آئیں۔ محمد شمس کیشب چندر سین کی اصلاحی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"کیشب چندر سین نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا اور اپنی پر زور خطابت سے مذہبی و اصلاحی امور سے متعلق نوجوانوں کے ایک بڑے گروہ کو اپنا ہم نوا بنالیا۔ انھوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ ذات پات کے بندھنوں کے خلاف آواز بلند کی۔ اور مختلف ذاتوں کے درمیان شادی بیاہ کے رشتہ کو جائز قرار دیا اور جہیز کے رواج کی مخالفت کی" ۳

کیشب چندر سین نے برہمو سماج میں شامل ہونے کے بعد اس تحریک کو آگے بڑھانے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ جس کے ذریعہ یہ تحریک لوگوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر گئی۔ مذہب کی تبلیغ کے لئے انہوں نے ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ بقول ڈاکٹر تارا چند:

"جدید ہندوستان کے لوگوں کے خیال میں ایکتا لانے میں یہ پہلی کوشش تھی جس کے نتیجہ میں مدراس میں "ویدسماج" اور مہاراشٹر میں "پرارتھنا سماج" کی بنیاد پڑی"۔

آپ نے بہت سی تنظیمیں مثلاً "گڈول فریٹرنٹی سوسائٹی"، "برہمو ہندو سماج" اور "برہمو ودیالے" وغیرہ قائم کیں۔ راجہ رام موہن رائے کی طرح آپ نے بھی معاشرہ میں اصلاح کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پردے کے رواج کو ترک کرنے، بیواؤں کی شادی بیاہ کرنے اور مختلف ذاتوں کے درمیان شادی کا سلسلہ قائم کرنے کی وکالت کی۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے بھی حامی تھے انہوں نے لڑکیوں کی کم سنی کی شادی اور کثرت ازدواج کے خاتمہ پر بھی زور دیا۔ انہوں نے ۱۸۶۰ء میں "سنگت سبھا" قائم کی۔ قدامت پسندوں کے اختلاف رائے کی بنیاد پر انہوں نے "برہمو سماج" سے قطع تعلق کر کے "برہمو سبھا آف انڈیا" کی تشکیل کی اور انہوں نے قدیم ہندو لٹریچر کی تفسیریں اور تراجم شائع کر کے ہندو مذہب کی وحدانیت پر زور دیا ہے۔

عبداللہ یوسف علی کیشب چندر سین کی اصلاحی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کیشب چندر سین نے ۱۸۷۰ء میں انگلستان سے واپس آنے کے بعد اپنی ذات کو ہندوستان کی اصلاحات کے لئے وقف کر دیا اور اس مقصد کے لئے ایک انجمن بنائی جس کے پانچ حصے تھے۔ یعنی طبقہ نسواں کی فلاح و بہبود تعلیم، ارزاں قیمت پر علمی کتابوں کی اشاعت۔ نشے کی چیزوں کو بند کرنے کی کوشش اور خیرات کی تنظیم۔ ۱۸۷۰ء میں

کیشب چندر سین نے سول میرج ایکٹ پاس کرایا جس کی رو سے
مذہبی رسوم کے بغیر عیسائی اور برہمو سماج کی شادی کی رسم
عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ اس ایکٹ کی بدولت ہندو سوسائٹی
سے برہمو سماج کا تعلق قطعی طور پر منقطع ہو گیا اور بت پرستانہ
رسوم اور بچپن کی شادی سماج میں تبدیل ہو گئی ۳؎

اس طرح کی دیگر مذہبی و سماجی اصلاح کی تحریکیں ملک کے مختلف حصوں میں بھی شروع ہو گئیں۔ بنگال کے علاوہ جس دوسرے حصہ میں اصلاح کی آواز اٹھائی گئی وہ مغربی ہندوستان تھا۔ جہاں مختلف تحریکوں اور تنظیموں نے۔ عورتوں کی تعلیم بیواؤں کی دوسری شادی اور شادی کی عمر کی حد بڑھانے ذات پات کی پابندیوں نیز مورتی پوجا کے مذمت کے سلسلہ میں بہت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ان اصلاحی تحریکات کی سرگرمیوں کا اثر تھا کہ کچھ ہی عرصہ بعد سارے ملک میں اس طرح کی تحریکیں عام ہو گئیں۔ اور ہر طرف بیداری کے آثار نظر آنے لگے۔ ۱۸۶۷ء میں بمبئی میں "پرارتھنا سماج" کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد ہندو مذہب میں پھیلی ہوئی برائیوں اور سماج کی اصلاح تھا۔ "مہادیو گووند راناڈے" جیسے لوگوں کی شمولیت کے ساتھ یہ تحریک سیکولر تنظیم کی حیثیت سے کام کرتی رہی اور ہندو سماج کی اصلاح و جدید کاری پر زور دیتی رہی۔

"پرارتھنا سماج کا پہلا مقصد سماج کی
اصلاح تھا۔ مہادیو گووند راناڈے اور آر۔جی۔بھنڈارکر جیسے لوگ
اس کے ممبر بنے تو اسکی اہمیت اور طاقت بڑھ گئی۔ اور اسکا
پرچار تیزی کے ساتھ ہوا۔ سماج میں تعلیم کو پھیلانے کے لئے
'سبودھ پتریکا' جاری کی۔ اور مزدور طبقہ کو تعلیم دینے کے لئے
نائٹ اسکول کھولا گیا" ۴؎

اسی عہد میں شمالی ہندوستان میں ہندوستانی سماج کی اصلاح کی ایک اور تحریک "سوامی دیانند سرسوتی" کی سرکردگی میں نشوونما پا رہی تھی۔ آپ نے مورتی پوجا کی مخالفت کرتے ہوئے ہندو مذہب کی اصلاح کے لئے ویدوں کی جانب رجوع کیا۔ آپ نے بچپن کی شادی کو ویدوں کے منافی قرار دیکر اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ آپ نے دوسرے مذہبوں میں غلط مروجہ روایات کی بھی مذمت کی اور ایک نئے انداز سے ویدوں کی تفسیر کی اور ہندو مذہب کو قدیم ویدوں کے عہد کی طرح پاک وصاف کرنے کی کوشش کی۔ وحدانیت کی تبلیغ کی اور بت پرستی کی مخالفت سے انھوں نے یہ ثابت کیا کہ ویدوں کے زمانہ کی سماجی زندگی میں ذات پات کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ عبداللہ یوسف علی لکھتے ہیں

"سوامی دیانند کی تعلیم تمام تر ویدوں کے متعلق تھیں۔ وید کے متعلق ان کے خیالات عام برہمنوں سے مختلف تھے۔ انھوں نے برہمنوں کے اس خیال پر شدید نکتہ چینی کی کہ صرف انھیں کو ویدوں کا مطالعہ کرنے یا سننے کا حق حاصل ہے۔۔۔۔۔۔ انھوں نے ان شرحوں پر جو ہندو مذہب کے بعد کے دور میں لکھی گئی پر شدید نکتہ چینی کی بلکہ ویدوں کے منافی اور ویدوں کی تاریخی حیثیت کے متعلق علماء مغرب کے نتائج کو بھی رد کر دیا۔ انھوں نے بت پرستی متعدد دیوتاؤں کی پوجا ویدانت کے مسئلہ وحدت الوجود اور اوتار کے مسائل کو بھی ناقابل قبول قرار دیا مگر یہ رائے بھی ظاہر کر دی کہ دیوتاؤں یا اعلیٰ مخلوق یا فرشتوں کا وجود ممکنات میں سے ہے۔ سوامی جی کی مذہبی رسوم میں اگنی کو بہت بڑا دخل ہے۔ ہنومی کی رسم جس میں ویدوں کے منتر پڑھے جائیں اور آگ پر گھی

جلا یا جائے۔ آریہ سماج کی عبادت کا مخصوص مذہبی عمل ہے"۔۹

شمالی ہندوستان کی یہ وہ پہلی تحریک تھی جس نے مذہب پر تنقید کرتے ہوئے اپنی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھایا جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ برہمنوں کے اختیارات کو بھی جھٹلایا اور مذہبی رسموں و مورتی پوجا کی بھی مذمت کی اور ذات پات کے نظام کی مخالفت کی جو کہ ہندو مذہب کا جزو ہے۔ اس تحریک کی سب سے نمایاں کامیابی تعلیم کے میدان میں ہوئی جس نے ملک بھر میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے لاتعداد اسکول اور کالج کھلوائے اور اسکولوں میں ہندی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کو شک وشبہات سے نجات دلانے میں بھی اس نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔" سی۔ الف۔ اینڈریوز نے اسے ہندوستان کی پہلی عوامی تحریک سے تعبیر کیا ہے

اسی عہد میں بنگال ایک دوسری مذہبی وسماجی اصلاح کی تحریک" رام کرشن پرم ہنس" نے ہندو مذہب اور سماج میں پھیلی ہوئی برائی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے ویدانت کے فلسفے اور بھگتی مارگ پر زور دیا ہے۔ بعد میں آپ کی اس تحریک کو "سوامی ویویکانند" نے آگے بڑھایا۔ آپ نے اپنے مشن کو پھیلانے کے لئے ملک کے مختلف حصوں میں ادارے قائم کئے۔ آپ نے اسی مقصد کے تحت مختلف ممالک کا دورہ بھی کیا اور مسلمان صوفیوں اور عیسائی راہبوں کی صحبت بھی اختیار کی۔ ۱۸۸۶ء میں "رام کرشن مشن" قائم کرکے اپنی تعلیم کا پرچار کیا۔ "سوامی ویویکانند نے اپنے دورہ امریکہ کے دوران ہندو فلسفہ کو دنیا کے سامنے آفاقی پیغام کی صورت میں پیش کیا۔ آپ نے یہ دلیل دی کہ ویدانت صرف ہندوؤں کا مذہب نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کا مذہب ہے۔ سوامی جی کی تعلیم نے ایک بہت بڑے طبقہ کو متاثر کیا اس کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں بھی مذہبی وسماجی اصلاح کی تحریکیں شروع ہوئیں مثلاً "تھیوسوفیکل سوسائٹی" کا قیام، بمبئی میں پرارتھنا سماج اور پارسیوں میں مذہبی اصلاح کی تحریک اور سکھوں میں بھی شروع کی گئی تحریک نے

بھی سماجی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا اور ایک بڑے طبقہ کو متاثر کیا۔

مذہبی و سماجی اصلاح کی یہ تحریکیں صرف ہندو سماج تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے بھی اپنے اپنے طور پر سماج سدھار کی تحریکیں شروع کیں مسلم معاشرہ میں بھی اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی حالت ہندوؤں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ بلکہ بعض اعتبار سے تو ان کے مسائل اور بھی زیادہ پیچیدہ تھے۔ سیاسی اقتدار ختم ہو جانے کے بعد مسلم طبقہ خاص طور پر اثر انداز ہوا۔ کیونکہ انگریزوں کو اقتدار حاصل کرنے کے لئے مسلمان حکمرانوں سے ہی جنگ کرنی پڑی اور یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں انگریزی تسلط قائم ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو ہی خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں مسلم عوام، حکمراں اور مذہبی رہنماؤں نے انگریزی فوج کے خلاف جنگیں لڑی تھیں۔ جب یہ بغاوت کچل دی گئی تو برطانوی حکومت نے مسلمانوں کو ہی بغاوت کا ذمہ دار قرار دیکر ان پر سخت مظالم ڈھائے۔ مسلم مخالف پالیسی اختیار کی اور ہر طرح سے مسلمانوں کو دبانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایسی حالت میں کچھ روشن خیال لوگوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح کی طرف توجہ کی کیونکہ مسلم معاشرہ بھی مذہبی بندھن کی وجہ سے جدید علوم سے بیزار تھا۔ جبکہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں نے جدید علوم کی طرف توجہ پہلے ہی کر لی تھی۔ چنانچہ ان میں سے کئی تحریکیں مسلم برادری کو جدید تعلیم فراہم کرنے اور پردے کے رواج اور کثرت ازدواج کے خلاف بھی مہم شروع کی اور نیز نئے خیالات کی روشنی میں مذہب کی تشریح کی۔ ان میں سے متعدد تحریکوں نے اپنے آپ کو جدید تعلیم کی توسیع اور سماجی اصلاحات کے لئے وقف کر دیا۔ نیز کچھ تحریکیں برطانوی حکومت کے خلاف سیاسی مخالفت کے لئے قائم ہوئیں۔ ان تحریکوں نے عوام کو تبدیلی کی ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس سلسلہ میں "نواب عبدالطیف" نے بنگال میں "۱۸۶۳ء میں انگریزی زبان نیز جدید علوم کی تعلیم کے حق میں ایک ادبی سوسائٹی "محمڈن لٹریری سوسائٹی" قائم کی جس نے بنگال میں کئی علمی ادارے قائم کئے۔

مسلمانوں میں قومی بیداری پیدا کرنے اور نئی تاریخی قوتوں اور زندگی کے نئے

تقاضوں کو سمجھنے اور اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنے کا درس دینے کے لئے اور بھی کئی تحریکیں سامنے آئیں۔ "احمدیہ تحریک" اور "دارالعلوم دیوبند" سہارنپور وغیرہ اس سلسلہ کی اہم کڑی ہیں۔ "قدیم دلی کالج" نے بھی مسلمانوں کے اندر نئے رجحان کو فروغ دینے میں بہت نمایاں کارنامے انجام دیئے۔

اسی عہد میں شمالی ہندوستان میں مسلمانوں میں اصلاح سے متعلق سب سے زبردست اور حیرت انگیز کام سرسید احمد خاں نے شروع کیا جس کو بعد میں سرسید تحریک اور علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کیا گیا۔ آپ کے اس مقصد کو آگے بڑھانے میں آپ کے رفقائے کار کا بہت زیادہ ہاتھ رہا ہے۔ سرسید ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ہندوستانیوں کی خاص طور پر مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کا بغور مطالعہ کیا اور انکی ضرورتوں پر غور کیا اور اپنی کوششوں سے زندگی کے ہر شعبہ کو مذہب، سیاست، ادب، تعلیم معاشرت اور ہندوستانی مسلمانوں کے درپیش مسائل کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ سرسید احمد خاں کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے نورالحسن نقوی لکھتے ہیں

> " سرسید احمد خاں نے بےعملوں کو جہد و عمل کا درس دیا۔ عزلت نشینوں کو گوشہ تنہائی سے نکال کر کھلی فضا میں سانس لینا سکھایا۔ ماضی کے پرستاروں کو حال کی اہمیت سے آشنا کیا۔ تنگ نظروں میں وسعت نظر سکھلائی اجداد کے کاموں پر فخر کرنے والوں کو اپنے آپ میں اوصاف پیدا کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ مشرق کے پجاریوں کو مغرب سے روشناس کیا۔ تقلید پرستوں کو اجتہاد کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ اور غور و فکر تجزیہ استدلال کی ضرورت سے باخبر کیا۔۔۔۔۔ انھوں نے سوتوں کو جگایا اور مردوں میں جان ڈال دی۔ غرض یہ کہ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو زندہ قوموں کی طرح زندگی گزارنے اور سربلند ہو کر جینے کا سلیقہ سکھایا۔" [۱۱]

سرسید احمد خاں مسلمانوں کو تاریک اور تنگ راستے سے
نکالنے کے لئے اور جدید علوم سے روشناس کرانے کے لئے پوری زندگی جدوجہد کرتے رہے۔ سرسید احمد
مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی ترقی و خوشحالی کے لئے انگلینڈ سے واپسی کے بعد رسالہ "تہذیب الاخلاق"
کا اجرا کیا۔ انگلینڈ میں وہ "ایڈیسن" اور "اسٹیل" سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ جنہوں نے قوم کی اصلاح کے
لئے اپنے رسالہ "ٹیٹلر" اور "اسپکٹیٹر" سے بہت مفید کام لیا تھا۔ سرسید پر ان اصلاحی کاموں کا خاصا اثر پڑا۔
اور انہوں نے "قوم کی اصلاح کا بیڑا بڑے ہی خلوص دل سے بیڑا اٹھایا اور اپنے عزیزوں و دوستوں اور کرم فرماؤں
کے تعاون سے سائنٹفک سوسائٹی اور پھر بعد میں ایم۔اے۔او کالج قائم کیا۔ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ
انہوں نے جدید تعلیم بالخصوص انگریزی تعلیم کے فوائد کو مدنظر رکھا اور اپنے مضامین کے ذریعہ اصلاح و معاشرہ
کا کام لیا۔ خود بھی لکھا اور اپنے رفقاء کار سے بھی لکھوایا۔ "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ سرسید نے سیاسی
سماجی اور تہذیبی و مذہبی مسائل پر سنجیدہ مضمون نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔ اور خاص طور پر انہوں نے
اصلاح معاشرت کے سلسلہ میں بکثرت مضامین لکھے۔

سرسید تحریک کی سب سے اہم خصوصیت عقلیت
پسندی ہے۔ انہوں نے توہم پرستی کے خلاف اور محض جذباتی کوششوں سے گریز کرنے اور جدید تہذیب و تمدن
اور تعلیم کی طرف رجحان مبذول کرایا۔ اس لحاظ سے سرسید کا یہ کارنامہ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے کہ
انہوں نے منطقی و استدلالی طرز و طریق اپناتے ہوئے جدید معاشرہ کے نشیب و فراز کو جدید تعلیم کی روشنی
میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ عام مسلمانوں کی ذہنی بیداری کے لئے محض تخیلیت اور تصوریت
کی دنیا سے نکل کر سماجی حقیقت کو عقلی دلائل کی روشنی میں سمجھنے اور جانچنے پر زور دیا ہے

غرضیکہ سرسید تحریک نے سیاسی و معاشرتی، تہذیبی و فکری
معاشی، علمی و ادبی اور مذہبی اقدار کی اصلاح کے لئے قدم اٹھایا۔ اور اگرچہ ان کی مخالفت بھی خوب کی
گئی تھی لیکن وہ کسی بھی عتاب سے بے خبر اپنے اصلاحی کاموں کے اغراض و مقاصد سے لگے رہے اور

استنباطی فعل پر غوروخوض کرتے رہے۔ اپنے ان اصلاحی کاموں کے اغراض ومقاصد کے لئے مغربی افکاروخیالات اور نظریات کو مشعل راہ بنایا۔ جس سے روشنی پاکر مغربی قومیں اس قدر طاقتوراور ترقی یافتہ ہوئی تھیں۔

سرسید کے سامنے بڑا مسئلہ صدیوں پرانے رسوم ورواج تھے۔

قدیم انداز فکر تھا توہم پرستی اور احیا پرستی تھی اور چونکہ قوم تعیش اور روایتی عفریت کے جنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس لئے ابتدا میں بہترے لوگوں نے سرسید کی ان کوششوں کی زبردست مخالفت کی مگر سرسید ان مخالفتوں سے بے نیاز ہوکر اصلاحی کاموں میں مصروف رہے۔ تعلیم نسواں کی حمایت میں اور پردے کے بے جا اور بے غرض چلن کے خلاف بھی انھوں نے جدوجہد شروع کی۔ جواہر لال نہرو نے "دی ڈسکوری آف انڈیا" میں بڑی وضاحت کے ساتھ سرسید کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سرسید نے سب سے پہلے مسلمانوں کی ترقی وخوشحالی اور فلاح وبہبود کے لئے جدید طرز تعلیم اور جدید فکری روایتوں کو مدنظر رکھا عورتوں کی تعلیم پر زور دیا اور پردہ کے غیر ضروری استعمال کی بھی مخالفت کی۔

اپنی انھیں سرگرمیوں کے ذریعہ انھوں نے ہندوستان کے عوام کی خدمت کی۔ ہرچند کہ سرسید احمد خاں پر کفر اور ملحد کے فتوے بھی صادر کئے گئے۔ لیکن انھوں نے اسکی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے مقصد کو لیکر آگے بڑھتے رہے اور مختلف مراکز قائم کرکے قومی اصلاح وفلاح کا کام لیتے رہے۔ اس سلسلہ میں سرسید کے رفقاء کار نے بھی بہت اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔

بہرحال سرسید احمد خاں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے فکروعمل کا رخ بڑی حدتک موڑ دیا اور سماج کا ایک بہت بڑا طبقہ ان کے ساتھ ہوگیا جس نے اصلاحی مقاصد کی تکمیل میں ان کا ساتھ دیا اور یہ انھیں کی برکتوں کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان قوم ملک کی تعمیروترقی میں حصہ لینے کے قابل ہوئی ہے۔

مندرجہ بالا تحریکوں نے ہندوستان کی سماجی و مذہبی زندگی کی تعمیر میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ جس کے زیر اثر کئی سماجی اصلاحات بھی عمل میں آئیں۔ ان مذہبی و سماجی اصلاح کی تحریکات نے خاص طور پر نئے متوسط طبقہ کی آئینہ داری کی ہے۔ کیونکہ انگریزی اقتدار قائم ہو جانے کے بعد متوسط طبقہ کی معاشی و معاشرتی زندگی تہہ و بالا ہو گئی تھی۔ اس طبقہ کے لوگ اپنی معاشی و سماجی زندگی کی فلاح و بہبود چاہتے تھے۔ وہ زندگی کے نئے سماجی رشتے و نئی معاشی و سیاسی قوتوں سے بیگانہ ہونا ان کا مقصد نہیں تھا اسلئے انھوں نے مغربی افکار و خیالات اور جدید تعلیم کی اہمیت بھی قبول کی۔ قرون وسطیٰ کے مابعد الطبیعیات پر اب انھیں کسی حد تک یقین نہ رہا۔ غرضیکہ انھوں نے ان مذہبی اور سماجی رسومات اصول و عقائد اور اقدار حیات کی مخالفت کی اور ان کے خلاف محاذ آرا ہوئے۔ جو ان کی گروہی و طبقاتی فلاح و بہبود اور مفادات کی راہ میں حائل تھے۔ مذکورہ بالا تحریکات ہندوستانیوں کے اجتماعی ذہنی رویہ کی آئینہ دار ہیں کیونکہ یہ غیر ملکی ملک کے مختلف حصوں میں چل رہی تھیں جس نے تقریباً پورے ملک کے لوگوں کو متاثر کیا ہے اور یہ غیر ملکی قومی احساس کے آغاز و عروج میں اثر انداز ہوئی ہیں۔

یہاں پر آریہ سماج تحریک کے پس منظر میں پریم چند کی وابستگی کا ذکر بھی لازمی ہے۔ کیونکہ پریم چند ان تحریکات سے بذات خود جڑے ہوئے تھے جنھوں نے ملک کی آزادی اور سماج کی اصلاح و فلاح کے لئے کام کیا ہے اور ملک میں قومی بیداری کی راہ ہموار کی یہاں پر سماجی و مذہبی اصلاح کی کوششوں کے بیان میں آریہ سماج کا ذکر لازمی ہے۔ پنجاب میں "سوامی دیانند سرسوتی" نے ۱۸۷۵ء میں ہندو معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائی اور غلط رسم و رواج کو ترک کرنے کے لئے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی۔ جس نے سماج میں پھیلی ہوئی فرسودہ روایات کو ختم کرنے، بچیوں کی بہتری، لڑکیوں کی تعلیم، جاگیردارانہ رشتوں اور غیر مذہبی رسم و رواج اور ضعیف الاعتقادی، توہم پرستی کا خاتمہ کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس طرح آریہ سماجی سماجی مساوات کے علم بردار تھے اور انھوں نے سماجی اتحاد اور اس کے استحکام کی کوشش کی اور عوام میں عزت نفس اور خود اعتمادی کی

روح بھی انھوں نے پیدا کی ۔

پریم چند خود بھی آریہ سماج کی اصلاحی تحریکات سے بہت زیادہ متاثر تھے انھوں نے اس موضوعات پر کئی مضامین اور کہانیاں بھی لکھیں۔ پریم چند آریہ سماج کی صرف اصلاحی تصورات سے متاثر تھے۔ کیونکہ ہندو سماج کی اصلاح وہ خود بھی کرنا چاہتے تھے۔ آریہ سماج جب انتہا پسند تحریک ہوگئی اور وہ اپنے کو ہندو مذہب مباشرت اور تہذیب کے اعتبار سے الگ جماعت تصور کرنے لگی۔ جب کہ یہ بات ہندوں کے قدیم روایات کے سراسر خلاف تھی اور بعد میں تو آریہ سماج نے شدھی کا الوکھا طریقہ وضع کرکے ملک کی فضا کو خاصا مکدر کر دیا اور ان کے اس رویہ سے فرقہ واریت کو فروغ ملا۔ خصوصاً آگے چل کر ترک موالات کے ہنگامی زمانہ میں شدھی اور سنگٹھن کی تحریک کو جس طرح سے چلایا گیا اس سے ہندو اور مسلمانوں میں شدید منافرت پیدا ہوئی اور ملک میں فتنہ و فساد کی آگ پھیل گئی۔ پریم چند نے اس کی شدید مخالفت کی انھیں اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ آریہ سماج تحریک ایک فرقہ وارانہ جماعت ہے جو تہذیب کا غلاف اوڑھکر سامنے آتی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ اپنے مضمون "سامپردائکتا اور سنسکرتی" میں لکھا ہے

> "فرقہ واریت تہذیب کا خول
> پہن کر آتی ہے۔ ہندو اپنی تہذیب کو قیامت تک محفوظ
> رکھنا چاہتے ہیں اور مسلمان اپنی تہذیب کو۔ حالانکہ دنیا میں
> صرف ایک تہذیب ہے اور وہ ہے اقتصادی تہذیب۔ ہم
> آج بھی ہندو مسلم تہذیب کا رونا روتے چلے جاتے ہیں....
> ..... تہذیب کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عیسائی
> مسلم یا ہندو تہذیب نام کی کوئی چیز نہیں ہے"[۱۱]

پریم چند اپنی زندگی میں ایسی تمام تحریکات کی شدید

مخالفت کرتے رہے ہیں جو فرقہ پرستی کو ہوا دیتی ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں آریہ سماجیوں نے ملک میں جب شدھی کی تحریک کا آغاز کیا تو پریم چند نے اس کے خلاف مضمون لکھا اور اس کی اشاعت پر زور دیتے ہوئے اپنے دوست "دیا نرائن نگم" کو ۱۳؍اپریل ۱۹۲۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ادھر میں نے اردو میں لکھنا بند سا
کر رکھا ہے۔ فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن شدھی پر ایک مختصر سا
مضمون لکھ رہا ہوں۔ مجھے اس تحریک سے سخت اختلاف ہے۔ تین
چار دنوں میں بھیجوں گا۔ آریہ سماج والے بھنائیں گے۔ لیکن مجھے
امید ہے کہ آپ اس مضمون کو 'زمانہ' میں جگہ دیں گے۔"[۳۱]

منشی پریم چند شدھی کے خلاف لکھے گئے مضمون "قحط الرجال" میں لکھتے ہیں

"ہندوؤں میں اس وقت سنجیدہ
رہنماؤں کا کال ہے۔ ہمارا رہنما وہ ہونا چاہئے جو سنجیدگی سے
مسائل پر غور کرے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ اس کی جگہ شور مچانے والوں
کے حصہ میں آجاتی ہے۔ جو اپنی زور دار آوازوں سے جنتا کے
چھپے ہوئے جذبات کو بھڑکا کر ان پر اپنا اقتدار جما لیتے ہیں۔ وہ
قوم کو درگذر کرنا نہیں سکھاتے۔ لڑنا سکھاتے ہیں۔ اسکا فائدہ اسی
میں ہے۔ کوئی آدمی ایسی الٹی عقل کا نہیں ہو سکتا کہ اس کو ایسے
نازک موقع پر دونوں فرقوں کی باہمی کھینچ تان کے نتیجے نہ
دکھائی دیں۔ اور اگر ہے تو ہمیں اس کی نیک نیتی پر شبہ ہے۔
اس شبہ کی تائید اس وجہ سے اور ہوتی ہے کہ اس تحریک
(سنگٹھن) کے شروع کرنے والے اور اس کے کارکن عہدہ دار

> وہی لوگ ہیں جو سیاسی معاملوں میں حصہ لینے سے کنارا کاٹتے ہیں یا اس میں حصہ لیتے ہیں تو آبرو بچاتے ہیں۔ ورنہ سنگٹھن کے بنارس میں منعقد ہونے والے جلسہ میں زمینداروں اور راجاؤں کی اتنی بڑی تعداد دکھائی نہیں دیتی ..... آج کون ہندو ہے جو ہندو مسلم اتحاد کے لئے جی جان سے کام کر رہا ہے جو اسے ہندوستان کا سب سے اہم مسئلہ سمجھتا ہو۔ جو سوراج کے لئے اتحاد کو بنیادی شرط سمجھتا ہو قوم کا یہ درد یہ ٹیس آج ہندوؤں میں کہیں نہیں دکھائی دیتی .... افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کانگریس نے بھی اجتماعی طور پر اس تحریک سے الگ تعلق رہنے کے باوجود انفرادی طور پر ہی اس میں شامل ہوئے ہیں۔ ایک بھی ذمہ دار کانگریس نیتا نے اعلان کرکے ان تحریکوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ نہیں کیا۔"

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شدھی کے خلاف لکھے گئے اس مضمون میں پریم چند نے اس تحریک سے ہونے والے نقصانات سے عوام کو آگاہ کیا اور اسے ہندوستان کی یکجہتی کے لئے خطرناک بتایا۔ انھوں نے آریہ سماج کی تحریک سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی اس کے غلط رویوں کی مخالفت کی۔ پریم چند نے ہر اس تحریک کا ساتھ دیا۔ اور اس رجحان کی پرزور حمایت کی جو ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے اور تحریک آزادی میں معاون ثابت ہو اور ہر اس تحریک کی مخالفت کی جو ان چیزوں کو نقصان پہونچائے۔

پریم چند ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ اس تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ ترقی پسند تحریک اپنے وقت اور حالات کی زائیدہ تھی۔ اور ایک اہم ضرورت بھی۔ ترقی پسند تحریک کا رشتہ دراصل آزادی کے ساتھ جڑا ہوا ہے

اور اس کے وجود میں آنے کے پیچھے ملک کے سیاسی سماجی و اقتصادی حالات کارفرما رہے ہیں بقول خلیل الرحمٰن اعظمی یہ وہ حالات تھے۔

"ہندوستان میں قومی بیداری کی جو لہر اٹھی تھی۔ اس میں اگرچہ بنیادی طور پر یہاں کے سیاسی و اقتصادی حالات اور برطانوی سرمایہ داری کی سخت گیریوں کو دخل تھا۔ لیکن قومیت کے جدید تصور کے ساتھ ہی بین الاقوامی مسائل کا شعور آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔۔۔ جب ۱۹۰۵ کے انقلاب روس سے ساری دنیا میں عوامی تحریکوں کا دھارا پھوٹ پڑا۔ اور ایشیا کے محکوم ممالک اپنی گہری نیند سے جونک اٹھے اور پھر ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے اثرات اور ہنگامہ بلقان میں ہندوستان کا ترکی سے تعاون اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اب سیاسی و سماجی مسائل کی سطح ملکی و علاقائی حدود سے نکل کر ایک وسیع تر سرحد میں داخل ہو رہی ہے۔۔۔۔ اس سیاسی بحران اور دوسری جنگ عظیم کے آثار سے پورے مغرب میں جو ہلچل پیدا ہوگئی اسکا اثر ہندوستانی طلباء پر خاص طور پر پڑا جو کہ یورپ کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔"[۱۵]

ان حالات و واقعات سے وہ ہندوستانی نوجوان جو کہ ان دنوں یورپ میں مقیم تھے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ انھیں دانشوروں نے لندن میں ۱۹۳۵ء میں لندن میں "ترقی پسند مصنفین" کی بنیاد ڈالی۔ ہندوستان آنے کے بعد "سجاد ظہیر" اور ان کے رفقاء نے یہاں پر بھی ترقی پسند مصنفین کی تنظیم شروع کی تو ہمارے ملک کے رہنماؤں بزرگ ادیبوں اور دانشوروں نے اس کا خیر مقدم کیا

اور اسکی بھرپور مدد اور حمایت کی۔ ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد ادب کو سماج کے حقیقی و بنیادی مسائل سے جوڑنا اور تہذیبی معاشرتی اور سیاسی بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کی ترجمانی کرنا اور ساتھ ہی دولت اور محنت کے افتراق، لوٹ کھسوٹ کو ختم کر کے مساوات کا نظام قائم کرنا رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ پریم چند جیسے حساس ادیب اس سے کیسے الگ رہ سکتے تھے۔

پریم چند کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی ذہنی و نظریاتی رہی ہے۔ کیونکہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنی پہلی کانفرنس میں جو اعلان نامہ پیش کیا تھا۔ اس اعلان نامہ کے خیالات و نظریات کو پریم چند نے اس سے قبل سے ہی اپنی تخلیقات میں جگہ دی تھی۔ انھوں نے انتقادی اور اشتراکی حقیقت نگاری کا رویہ اختیار کیا تھا۔ برطانوی سامراج کی غلامی، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ استحصالیت کے وہ مخالف تھے اور ادیب کی وابستگی اور عوام الناس کے مفادات خواہشات آرزوؤں اور تمناؤں کے پیامبر انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس (اپریل ۱۹۳۶ء) کی پریم چند نے صدارت کی۔ اس موقع پر انھوں نے جو صدارتی خطبہ پڑھا، وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں انھوں نے واضح کیا کہ ادب کیا ہے اسکے فوائد کیا ہیں اور ایک ادیب کے فرائض کیا ہیں، انھوں نے ادب کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ

"ادب کی بہت سی تعریفیں
کی گئی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات
ہے۔ چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی۔ اسے
ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے"۔[۱۶]

انھوں نے مزید کہا کہ

"مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں
اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان پر تولتا ہوں
بیشک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہے۔ اور ہماری
روحانی مسرت کی کنجی ہے۔ لیکن ایسا کوئی ذوق معنوی یا

روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنی افادی پہلو نہ رکھتی ہو
مسرت خود ایک افادی شئے ہے اور ایک ہی چیز سے ہمیں
افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی حاصل ہوتی ہے اور غم بھی۔
آسمان پر چھائی شفق بیشک ایک خوشنما نظارہ ہے۔ لیکن اساڑھ
میں آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی
کیونکہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے .... ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا
ابھی تک اسکا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امراء کے
دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ انھیں کی قدر دانی پر اس کی ہستی
قائم تھی۔ اور انھیں کی خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں
کی تشریح و تفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔ اسکی نگاہیں محل سراؤں اور
بنگلوں کی طرف اٹھتی ہیں۔ جھونپڑے اور کھنڈر اس کے قابل نہ تھے
انھیں انسانیت کے دامن سے وہ خارج سمجھتا تھا۔ آرٹ نام تھا
محدود صورت پرستی کا الفاظ کی ترکیبوں کا خیالات کی بندشوں کا
زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں۔ زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں"[۱۴]

آخر میں انھوں نے ادب کو پرکھنے کی یہ کسوٹی بتائی۔

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے
گا۔ جس میں تفکر ہو آزادی کا جذبہ ہو۔ حسن کا جوہر
ہو تعمیر کی روح ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو
جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں۔
کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی"[۱۵]

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پریم چند کے اس خطبہ صدارت سے ہندوستانی ادیبوں فنکاروں اور نوجوانوں کو ادب اور زندگی کے رشتے، ادیب کے فرائض اور ادب کے مقاصد جیسے اہم سوالات کو سمجھنے اور عوام سے وابستگی کا رویہ اختیار کرنے کی تحریک ملی اور خاص طور پر ترقی پسند تحریک کو تقویت پہونچی۔

حوالہ جات

۱۔ عبداللہ یوسف علی ۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ۔ ص ۔ ۱۶۰

۲۔ بمل چندرا ۔ جدید ہندوستان ۔ ص ۔ ۲۳۰

۳۔ عبداللہ یوسف علی ۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ۔ ص ۔ ۱۰۵

۴۔ عبداللہ یوسف علی ۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ۔ ص ۔ ۲۳۰

۵۔ قمر رئیس ۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ۔ ص ۔ ۷۷

۶۔ ڈاکٹر تارا چند ۔ تاریخ تحریک آزادی ہند ۔ ص ۔ ۲۱۰

۷۔ عبداللہ یوسف علی ۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ۔ ص ۔ ۲۶۵

۸۔ ڈاکٹر تارا چند ۔ تاریخ تحریک آزادی ہند ۔ ص ۔ ۳۵۳

۹۔ عبداللہ یوسف علی ۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ۔ ص ۔ ۲۶۷

۱۰۔ بمل چندرا ۔ جدید ہندوستان ۔ ص ۔ ۲۲۶

۱۱۔ نورالحسن لکھنوی ۔ سرسید اور ہندوستانی مسلمان ۔ ص ۔ ۳۷

۱۲۔ کنور پال سنگھ ۔ مرتب ، پریم چند اور جنوادی سماجیہ کی پرمپرا ۔ ص ۔ ۷

۱۳۔ دیانرائن نگم ۔ مضمون ، پریم چند کے تصورات ۔ مرتب ، قمر رئیس ۔ پریم چند شخصیت اور کارنامے ۔ ص ۱۷۰

۱۴۔ شہباز حسین ۔ مضمون ، پریم چند کی شخصیت کے چند پہلو ۔ بحوالہ ۔ زبان و ادب ماہنامہ ۔ اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ ۔ ص ۔ ۳۷

۱۵۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ۔ ص ۔ ۳۱

۱۶۔ ہنس راج رہبر ۔ پریم چند ۔ مضمون ۔ خطبہ صدارت ۔ ص ۔ ۲۵۷

۱۷۔ ہنس راج رہبر ۔ پریم چند ۔ مضمون ۔ خطبہ صدارت ۔ ص ۔ ۲۶۰

۱۸۔ ہنس راج رہبر ۔ پریم چند ۔ مضمون ۔ خطبہ صدارت ۔ ص ۔ ۲۷۷

باب سوم

پریم چند اور تحریک آزادی

(۱) ہندوستان میں تحریک آزادی

(۲) انڈین نیشنل کانگریس اور جدوجہد آزادی

(۳) گاندھی جی اور تحریک آزادی

(۴) پریم چند کے یہاں آزادی کا تصور

(۵) تحریک آزادی اور پریم چند

بیسویں صدی کا آغاز نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی تاریخ میں کشمکش اور ہنگاموں سے عبارت ہے۔ اس صدی کی ابتدا سے ہی سیاسی، سماجی، اقتصادی و معاشی کشمکش زور پکڑ جاتی ہے۔ ایک طرف سامراجیت امریکہ، افریکہ، ایشیا اور یوروپ کو دھکے ہو رہے تھے۔ تو دوسری طرف کچھ انقلابی قدریں بھی سر ابھار رہی تھیں۔ ۱۹۰۵ء میں روس کے اندر محنت کش عوام نے زاری حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور سوشلزم قائم کرنے میں مصروف تھے۔ ہر چند کہ یہ کوششیں ناکام رہیں لیکن اس سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ عوام اپنے حقوق سے واقف ہو چکے ہیں اور حالات کسی بھی وقت بدل سکتے ہیں۔ یہ صورت حال صرف ایک روس تک محدود نہیں تھی بلکہ افریقہ اور یوروپ کے مختلف ممالک بھی آزادی کی جدوجہد کر رہے تھے۔

ہندوستان میں بھی آزادی کی تحریک شدت اختیار کر چکی تھی۔ ایسا لگنے لگا تھا کہ ہندوستان بھی اب زیادہ دنوں تک سامراجیت کا غلام نہیں رہے گا۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ایک طرف جہاں ترقی پسند ذہن جنم لے رہے تھے وہیں سامراجیت کے نشہ میں چور فاشسٹ ذہنیت بھی پروان چڑھ رہی تھی۔ جس نے اپنے گندے مقصد کو آگے بڑھانے کے لئے انسان کے خون کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ جس کے نتیجہ میں ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ جس نے چار سال کی طویل مدت میں انسانیت کو اجنبیت کے قریب لاکر کھڑا کر دیا۔ ابھی یہ جنگ ختم نہیں ہوئی کہ وقت نے ایک اور کروٹ بدلی اور زاری غلامی میں جکڑا ہوا روس لینن کی قیادت میں فتح حاصل کر گیا۔ جب یہ جنگ ختم ہوئی تو

وقت نے ثابت کردیا کہ عوام سے بڑھکر دنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے۔ انقلاب روس نے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے تمام مظلوم انسانوں کو متاثر کیا اور ان کی زندگی کو نیا شعور بخشا جو خوشی آئندہ مستقبل کی ضمانت دیتا تھا۔ سجاد ظہیر نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

"پہلی جنگ عظیم کے بعد ہمارے ملک میں زبردست ہلچل پیدا ہوئی۔ جنگ کے زمانہ میں انگریز سامراجیوں نے ہمارے ملک کا شدید استحصال کیا۔ جنگ کے بعد اقتصادی حالات اور بھی زیادہ خراب ہوئے۔ بے روزگاری کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا۔ اکثر تاجروں اور صنعت کاروں کو بھی بحرانی دور سے دوچار ہونا پڑا........ دوسری طرف انقلاب روس نے زارشاہی کا تختہ الٹ کر ساری ایشیا کی محکوم قوم میں آزادی کی ایک نئی لہر پیدا کردی ح وسطی ایشیا کی قوموں نے روسی سامراجیوں کا جوا اتار پھینکا۔ ایران، ترکی اور روس کے انقلابی مزدور اور کسان حکومت کی مدد اور حمایت حاصل کرکے انگریز سامراجیوں کو اپنے ملکوں سے نکال رہے تھے۔ چین میں بھی قومی تحریک زوروں پر تھی اسی زمانہ میں ہمارے یہاں بھی قومی تحریک زوروں پر تھی۔" ؎

اس انقلاب کے اثرات صرف محنت کشوں تک محدود نہیں رہے بلکہ اس سے ایشیائی عوام کا وہ متوسط طبقہ بھی متاثر ہوا جو کہ اپنے اپنے ملکوں میں آزادی کی جدوجہد کی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ہندوستان بھی برطانوی غلامی سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چونکہ ہندوستان پر برطانوی فتح نے اپنے طرز عمل کے ذریعہ یہاں کے سماجی، سیاسی و اقتصادی ڈھانچہ کو منتشر کر

رکھا تھا۔ لہٰذا یہاں بھی اسی طرح کا قومی جذبہ پیدا ہوا جس طرح سامراجی سازشوں کے شکار دنیا کے دوسرے ممالک میں ہوا تھا۔ ہندوستان میں یہ قومی جذبہ رفتہ رفتہ جدوجہد آزادی کی شکل اختیار کر گیا۔ آزادی کی تحریک شروع میں تعلیم یافتہ عوام کے چھوٹے طبقوں نے آئینی تحریک کی شکل میں شروع کی لیکن بعد میں ہندوستان کے عوام کی ایک زبردست اکثریت اس انقلابی جدوجہد میں شامل ہو گئی۔ اب یہ محض آئینی تحریک نہ رہی بلکہ سیاسی آزادی کے حصول کے علاوہ جمہوریت اور سماجی مساوات پر مبنی ہندوستانی سماج کی تعمیر نو کی جدوجہد بن گئی۔

ہندوستان میں "قومی تحریک کی ابتدا" راجہ رام موہن رائے" کے وقت سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی "بغاوت" بھی ہندوستان کو برطانوی سامراجیت سے آزاد کرانے کی پہلی کوشش تھی۔ ہر چند کہ یہ "بغاوت" دبا دی گئی۔ لیکن سیاسی طور پر اس سے ہندوستان کی عوام پہلے سے زیادہ باشعور ہو گئی اور "قومی بیداری کی تحریک" روز بروز زور پکڑتی رہی۔ ملک میں مختلف سیاسی جماعتیں "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" "انڈین ایسوسی ایشن" اور "بمبئی ایسوسی ایشن" وجود میں آئیں۔ جنہوں نے عوام کے حقوق کے مطالبے برٹش گورنمنٹ کے سامنے رکھے۔ لیکن ۱۸۸۵ء میں ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ اسی سال ۱۸۸۵ء میں "انڈین نیشنل کانگریس" کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے آگے چل کر آزادی کی تحریک میں سب سے اہم رول ادا کیا۔ اور اسی کانگریس کی قیادت میں ملک نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی حاصل کی۔ "ڈاکٹر بی۔ پٹابھائی۔ سیتا رامیہ" نے "تواریخ کانگریس" میں اس کو جدوجہد آزادی کی تاریخ کہا ہے۔ لکھتے ہیں ۔

> "کانگریس کی تاریخ ہندوستان میں جدوجہد آزادی کی تاریخ ہے۔ کانگریس نے غیر ملکی غلبہ سے نجات دلانے کی کوشش کی ہے جس کی ابتدا ہندوستان میں تجارت کے آغاز سے ہوئی تھی۔"

اپنے ابتدائی عہد میں کانگریس کے مطالبے اعتدال پر مبنی ہوتے تھے۔

وہ صرف تعلیم یافتہ متوسط طبقہ اور ہندوستانی صنعت کاروں کے مفاد کی حمایت کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ عوام تک اس کی رسائی نہیں تھی اور اس کے مطالبات بھی بنیادی طور پر درمیانی طبقے اور نئے ابھرنے والے صنعت کاروں کے مطالبات تھے۔ تاہم اپنے ابتدائی مراحل میں بھی اس نے ہندوستانی قومی تحریک کے فروغ میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔" ڈاکٹر بی پٹابھائی سیتا رامیہ نے کانگریس کے مطالبات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

"ابتدا میں کانگریس کا مقصد اعتدال پسند رہا ہے جس کا مقصد صوبائی اور نیز مرکزی مجلس قانون ساز میں ہندوستانیوں کی شمولیت، تعلیم کی توسیع، فوجی اخراجات میں کمی، ہندوستان میں صنعتی ترقی، زرعی قرضوں میں سہولت وغیرہ رہا ہے"

لیکن رفتہ رفتہ لوگوں کے رجحان میں تبدیلی آتی گئی اور کانگریس کے اجلاس میں حکومت پر نکتہ چینی بڑھنے لگی۔ اور زیادہ سے زیادہ انقلابی مطالبات پیش کئے جانے لگے۔ نتیجہ کے طور پر وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانی ممبر نامزد کرنے کی تجویز ۱۸۹۲ء کے "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" کے تحت قبول کر لی گئی پھر بھی ان کی حیثیت صرف مشاورتی تھی۔ گرچہ یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی لیکن پھر بھی اسے آزادی کی طرف ایک قدم سمجھا گیا اور لوگوں نے پسند بھی کیا۔ لیکن ساتھ ہی کانگریس کے اندر ایک ایسا گروہ جنم لے رہا تھا جو کہ کانگریس کی اس کارکردگی سے خوش نہیں تھا۔ اس گروہ کو انتہا پسند کہا گیا۔ اس نے طاقت کے زور پر عوام کے حقوق حاصل کرنے کی بات شروع کر دی۔ اس تحریک نے حکومت کے سامنے محض اپیلیں جاری کرنے کی روش ختم کر دی اور نئے انقلابی طریقے اختیار کئے اور جو مطالبات ان کے ذریعہ پیش کئے گئے وہ انقلابی کردار کے حامل ہوتے گئے۔ ان انتہا پسند رہنماؤں نے (جنھیں اعتدال پسند کہا جاتا تھا) کی پالیسی کی سخت مذمت کرنی شروع کر دی نتیجہ کے طور پر ۱۹۰۷ء میں سورت کانفرنس کے بعد کانگریس دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔

تقسیم بنگال کے بعد ملک بھر میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ پورے ملک میں ہنگامہ خیز حالات پیدا ہوئے۔ اسی دوران بائیکاٹ اور سودیشی کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ اس تحریک کا مقصد دیسی صنعتوں کا فروغ تھا۔ سودیشی تحریک کے ساتھ انگریزی مال کے بائیکاٹ کی تحریک چلائی گئی اور یہ تحریکیں غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جذبہ پیدا کرنے کا بہت طاقتور ذریعہ ثابت ہوئیں۔ سودیشی اور بائیکاٹ کی تحریکیں رفتہ رفتہ سارے ملک میں گئیں۔ غیر ملکی سامان فروخت کرنے والی دکانوں کے سامنے دھرنے دیئے گئے اور غیر ملکی اشیاء کو نذر آتش بھی کیا گیا۔ برطانوی حکومت نے اس تحریک کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہاں تک کہ جلسوں ومظاہروں پر پابندی عائد کر دی گئی۔

> "۱۹۰۷ میں "باغیانہ اجتماع ایکٹ"
> اور "انڈین پریس ایکٹ" نافذ کر کے اس تحریک کو کچلنے کی کوشش کی۔
> لیکن اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور یہ ہوا پورے ہندوستان میں
> پھیل گئی۔ آخر کار حکومت کو مجبور ہو کر تقسیم بنگال کی منسوخی کا
> اعلان ۱۹۱۱ء میں کرنا پڑا۔"

ہندوستان کی عوام کو اس کامیابی کے بعد اب یہ یقین ہو چکا تھا کہ حکومت کے سامنے آئینی اصلاحات اور مراعات کے لئے التجائیں بے سود ہیں۔ اگر کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے تو عملی جدوجہد کے ذریعہ۔ اس احساس نے ہندوستان کی عوام میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اسی بیچ سودیشی اور بائیکاٹ کی تحریکوں کے ساتھ عوام میں جوش پھیلا تو کانگریس کے سیاسی حلقوں میں پھوٹ کے آثار نظر آنے لگے۔ مسٹر گوکھلے اور دوسرے اعتدال پسند لیڈر اب یہ محسوس کرنے لگے کہ ناعاقبت اندیشی کی گفتگو اور کارروائی سے فائدہ کے بجائے زیادہ نقصان پہونچے گا۔ اور ممکن ہے کہ اس سے ہندوستان کی آئینی تحریک کی رفتار رک جائے۔ دوسری طرف "لارڈ منٹو" کی گورنمنٹ نے "مسٹر جان مارلے" کے مشورے سے جو اس وقت لبرل وزیر ہند تھے ہندوستان میں بے چینی کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے آئینی اصلاحات کی بنیاد ڈالی جبکہ

ابتدا ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسی جماعت بھی پیدا ہوگئی جو حکومت کی سخت مخالف تھی اور اس کے ساتھ کوئی مصالحت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ آئینی کام کے عمدہ نتائج کی قائل نہیں تھی اور خفیہ سازشوں قتل اور تشدد کے طور طریقوں کو سرگرمی کے ساتھ عمل میں لاتی تھی۔ اور ان پر عمل کرتی تھی۔ یہ لوگ اپنے طور پر تحریک آزادی اور کانگریس کو چلاتے رہے۔

۱۹۱۵ء کے بعد ہندوستان کی سیاسی تحریک میں کانگریس کے اندر رہ کر "مسز اینی بسنٹ" اور "تلک" کی رہنمائی میں "ہوم رول لیگ" کی تحریک شروع ہوئی جس کے زیر اثر سوراج کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس نے بھی خود اختیاری حکومت کا مطالبہ شروع کیا۔

اسی دور میں "موہن داس کرم چند گاندھی" ہندوستانی سیاست میں تحریک آزادی کے علمبردار کی حیثیت سے نئے خیالات کے ساتھ داخل ہوئے۔ وہ اپنے خیالات کو مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی خیالات سے منطبق کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی تشدد اور خفیہ سازشوں کے مخالف تھے۔ اس مقصد کے لئے وہ ایک مضبوط اور باقاعدہ طور پر ایک منظم جماعت قائم کرنے کے حامی تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد انھوں نے "احمد آباد" کے قریب "سابرمتی" کے مقام پر ایک آشرم بھی قائم کیا۔

گاندھی جی نے اپنے فلسفۂ "عدم تشدد و مزاحمت" کو جب ہندوستان میں عملی جامہ پہنایا تو سوراج کی تحریک میں لاکھوں عوام شامل ہوگئے۔ گاندھی جی اور کانگریس کی رہنمائی میں انتہائی زبردست عوامی تحریکیں چلائی گئیں۔ ان تحریکوں کے ذریعہ قانون کی خلاف ورزی بھی کی گئی۔ پر امن مظاہرے کئے گئے عدالتوں کا بائیکاٹ کیا گیا اور دفتروں میں کام بند کرایا گیا۔ تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ شراب نیز غیر ملکی ساز و سامان بیچنے والوں کی دوکانوں پر دھرنے دیئے گئے۔ ٹیکسوں کی ادائیگی رکوائی گئی اور بڑے بڑے بیوپار بند کروائے گئے۔ عدم تشدد پر مبنی ان طریقوں نے سماج کے ہر حصہ سے تعلق رکھنے والے لاکھوں عوام کو متاثر کیا اور ان میں بہادری و خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا۔ اب لاکھوں عوام نے حکومت کے جبر و ظلم کا سامنا کیا۔ بڑی بہادری کے ساتھ اپنے آپ کو گرفتار کروایا نیز لاٹھی چارج اور گولیوں کا سامنا کیا۔

گاندھی جی نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں شامل ہونے کے بعد سب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں بہار میں "چمپارن" کے مقام پر ستیہ گرہ کی مہم شروع کی جس کی غرض نیل کے کاشت کاروں کی شکایت کو دور کرنا تھا جو کامیاب بھی رہی۔ اس کے بعد احمد آباد کے مقام پر مل میں کام کرنے والوں کی ہڑتال اور ضلع کیرا میں ٹیکس نہ ادا کرنے کی مہم کامیابی کے ساتھ چلائی۔ ۱۹۱۹ء میں "رولٹ بل" کے خلاف اپنی ستیہ گرہ کے ذریعہ انھوں نے ملک میں ہلچل پیدا کر دی اور امرتسر جلیانہ والا باغ حادثہ کے سلسلہ میں جو کمیشن مقرر ہوا اسکے کام کی تنظیم بھی کی۔ ۱۹۲۰ء میں کانگریس اور خلافت تحریک کا مل کر کام کرنا آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں عدم تعاون کی عوامی تحریک کو منظم کیا جو ساری قوم پر ایک سیلاب کی طرح چھا گئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ پہلی بار ہوا کہ ہندو مسلم ایک مشترک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوئے۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اپکی کوششوں کے نتیجہ میں ہی آریہ سماجی سوامی شردھانند اور مولانا عبدالباری جیسے رہنما یکجا ہوئے۔

گاندھی جی نے اپنے خیالات کو پھیلانے اور تحریک آزادی کو آگے بڑھانے کے لئے "نوجوان" اور "ینگ انڈیا" کی ادارت بھی کی جسکی وجہ سے آپ کو باغیانہ مضامین لکھنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن جلد ہی خرابی صحت کی وجہ سے رہا کر دیا گیا اسکے بعد آپ نے فرقہ وارانہ اتحاد کی خاطر برت بھی رکھا۔

گاندھی جی مدت کے ساتھ کھادی اور سودیشی کی مہم چلاتے رہے اور عوام میں حکومت برطانیہ کے خلاف ابھرتے ہوئے جذبات کا مطالعہ کرتے رہے۔ مارچ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے نمک ستیہ گرہ شروع کی اور گرفتار کئے گئے۔ بعد میں انھیں رہا کر دیا گیا تاکہ وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کر سکیں۔ "لارڈ ارون" سے سمجھوتہ کے بعد وہ کانگریسی نمائندے کی حیثیت سے لندن میں دوسری گول میز کانفرنس ۱۹۳۱ء میں شرکت کے لئے گئے مگر ناکام واپس لوٹنا پڑا۔ وطن واپس آنے کے بعد سول نافرمانی شروع کرنے کے جرم میں پھر گرفتار کر لیا گیا مگر ملک کی فلاحی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

ہندوستان کو دوسری عالمی جنگ میں بغیر کسی مشورہ کے شامل کرنے کے حکومت برطانیہ کے اس عمل سے گاندھی جی بہت بڑا شدید ردعمل ہوا۔ اور انھوں نے جنگ کے خلاف خیالات کا اظہار کرنے کے لئے انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی۔ ۱۹۴۲ء میں "کیبنٹ مشن" کے ناکام ہوجانے کے بعد گاندھی جی نے اپنی "تاریخی قرار داد" "ہندوستان چھوڑو" پیش کی اور اپنے ہم وطنوں کو کرنے یا مرنے کا نعرہ دیا۔ اس کے جرم میں آپ کو گرفتار کرکے پونا میں نظر بند کر دیا گیا۔ جیل سے رہائی کے بعد ۱۹۴۴ء میں "برٹش کیبنٹ مشن" کے ساتھ اقتدار کی منتقلی کے متعلق تبادلہ خیال کیا۔ بالآخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوا۔

گاندھی جی کی تحریک آزادی کی ایک زبردست خوبی یہ رہی ہے کہ انھوں نے سماجی اصلاح کو قومی تحریک کا ایک جزو بنا کر پیش کیا۔ سماجی اصلاح کے سلسلہ میں ان کی سب سے بڑی اور اہم کامیابی چھوت چھات کے غیر فطری رواج کے خلاف چلائی گئی مہم تھی۔ چھوت چھات کے رواج نے ہندوستان کے لاکھوں عوام کو جانوروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کی دوسری اہم کامیابی گھریلو صنعت کے شعبہ میں تھی۔ گاندھی جی نے چرخے میں گاؤں کے عوام کی نجات دیکھی اور چرخے کا فروغ کانگریس کے ایک پروگرام کے حصہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ چرخے نے عوام کو جذبہ قوم پرستی سے لیس کرنے کے علاوہ لاکھوں انسانوں کو روزگار فراہم کیا اور عوام کا ایک ایسا طبقہ تیار کر دیا جو آزادی کی جدوجہد میں مرمٹنے اور جیل جانے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ چرخہ اس قدر اہم ہوگیا کہ آخر کار "انڈین نیشنل کانگریس" کے پرچم کا ایک حصہ بن گیا۔ آپ نے اپنے آپ کو ہندو مسلم اتحاد کے لئے بھی وقف کر دیا۔ آپ فرقہ پرستی کو غیر انسانی اور قوم مخالف قرار دیتے تھے۔ آپ کی رہنمائی میں قومی تحریک میں اتحاد پیدا ہوا۔ اور ہندوستانی عوام آزادی کی راہ میں آگے بڑھتے چلے گئے اور ملک نے گاندھی جی اور کانگریس کی قیادت میں آزادی حاصل کی۔

آزادی کسی بھی ملک کے لئے بیش قیمت شے ہوتی ہے

ہندوستان کی عوام برطانوی دور حکومت میں اپنی فطری، سیاسی، معاشی اور قومی آزادی سے محروم ہو چکی تھی۔ کیونکہ ہندوستان برطانوی سامراجیت کا غلام تھا اور سامراجیت تیزی کے ساتھ اپنا دامن ملک کے دور دراز علاقوں پر پھیلاتی جا رہی تھی۔ شہروں، قصبوں اور گاؤں کا اقتصادی ڈھانچہ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ جس کا سب سے برا اثر مزدوروں، کسانوں اور چھوٹے طبقے کے لوگوں پر پڑ رہا تھا۔ گاؤں کے لوگ سرمایہ داروں اور زمینداروں کے استحصال سے کچلے جا رہے تھے۔ جس کا اثر ہندوستان کے ہر شعبہ زندگی پر پڑا۔ اور ہندوستان کی عوام اپنے آپ کو اس غلامی سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پریم چند بذات خود تحریک آزادی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے۔ ان کا آزادی کا تصور صرف غیر ملکی حکمرانوں سے آزاد ہونا نہیں تھا بلکہ مزدوروں کسانوں کا جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں ہو رہے استحصال سے بھی آزاد ہونا تھا۔ اسی کو وہ پورن سوراج کہتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے مضمون "آزادی کی لڑائی" میں سوراجیہ کے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا ہے

> "سوراجیہ کا مطلب صرف آدمیوں کی
> تبدیلی سے نہیں ہے بلکہ پورے ڈھانچہ میں تبدیلی سے ہے"

پریم چند کا سوراجیہ صرف غیر ملکی حکمرانوں سے نجات حاصل کرنا نہیں بلکہ ان بورژوا اور جاگیردار طبقوں کے ہاتھوں ہو رہے استحصال کو بھی ختم کرنا ہے۔ جو ہندوستان کی غریب عوام مزدور اور کسانوں کا استحصال کرتے رہے ہیں۔ جاگیردار طبقہ کے ہاتھوں سوراجیہ کی مخالفت کو پریم چند نے نشانہ بنایا اور اس کے ساتھ متوسط طبقہ کی خود غرضی پر منحصر سیاست کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔ کیونکہ یہ طبقہ عوام سے زیادہ اپنے مفاد کو اہمیت دیتا تھا اور اپنی تھوڑی سی دی ہوئی قربانی کا کہیں زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور آزادی کو کسی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی سمجھوتہ کر لیتا تھا۔ ان لوگوں کے ہاتھوں لائے ہوئے سوراج کو بھی وہ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

> "اگر سوراج آنے پر بھی جائداد کی

حکمرانی رہی اور تعلیم یافتہ طبقہ یوں ہی خود غرض بنا رہے تو
میں کہوں گا کہ ایسے سوراج کا نہ آنا اچھا ہے۔ کم از کم میرے
لئے سوراج کا یہ مطلب نہیں ہے"۔

پریم چند کے مضمون "سوراجیہ کے فائدے" سے ان کے سوراجیہ کے متعلق نظریہ پر روشنی پڑتی ہے جو کہ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں انھوں نے سوراجیہ کے فائدے اور اسکی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے ان کے سیاسی خیالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور تصور آزادی کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کس قسم کی آزادی چاہتے تھے۔ لکھتے ہیں

"دیش کا پورا انتظام پرجا کے ہاتھوں میں ہو تو اسے سوراجیہ کہتے ہیں۔ اور پرجا اپنے چنے ہوئے پنچوں کے ذریعہ اپنے اوپر راج کرتی ہے۔ وہاں یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ پرجا لگان اور کروں سے دبی رہے اور انتظامیہ روز بروز فوج بڑھاتے جائیں۔ پرجا بھوکوں مر رہی ہو۔ چاروں طرف اکال پڑا ہو اور دیش کا اناج دوسرے ملکوں کو ڈھویا جا رہا ہو۔ غریب مسافروں کو ریل گاڑیوں میں بیٹھنے کی جگہ نہ ہو اور ادھیکاریوں کے لئے ایک ایک پوری گاڑی کھلی رہتی ہو ...... بلکہ سوراجیہ کے تین بھید ہیں ایک کے ذریعہ اپنی خواہش کے مطابق حکومت کرنا دوسرے راجہ کے ذریعہ عوام کے چنے ہوئے امیدواروں کے ذریعہ حکومت کرنا۔ تیسرے عوام کے چنے ہوئے امیدواروں کے ذریعہ مقررہ وقت تک حکومت کرنا۔ ہندوستان میں اس وقت تک ان میں سے کوئی بھی کارگر نہیں ہے۔ ہم تو صرف عوام کے چنے ہوئے پنچوں کی صلاح سے چلنے والی شاسن ہو سکنا چاہتے ہیں"۔

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پریم چند کے خیالات سوراجیہ سے متعلق بڑے سلجھے ہوئے ہیں۔ ان کا سوراجیہ کا نظریہ ایسا ہے جس میں سرمایہ داری، جاگیرداری کسی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ پریم چند نے اس مضمون میں بعض باتیں ایسی بھی لکھی ہیں جن سے ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور سماجی ڈھانچہ کے پیچیدہ سوالوں پر ان کی گہری نظر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اپنے اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

"سوراجیہ حاصل کرنے کا ذریعہ

ان نظاموں کو ترک کرنا ہے جو ہماری روح کو دبا دیتے ہیں اور اسے مفتوح کرتے ہیں۔ عدالتیں، سرکاری نوکریاں سرکاری تعلیم وغیرہ ہماری روح کو کچلنے والی، ہمارے جذبات کو دبانے والی اور ہمیں کوڑی کا غلام بنانے والی اور ہماری واسناؤں کو بھڑکانے والی تنظیمیں ہیں ہمارے لوگ بچپن سے ہی سرکاری نوکریوں کی آشا کرنے لگتے ہیں۔ اسی وقت سے انکی آتمہ رکشا کی طاقت ختم ہونے لگتی ہے۔ انھیں کلے بندھے کی طرح اپنے دڑبے کے علاوہ کچھ سجھائی نہیں دیتا ہے۔ چاپلوسی کرنے اور کاسہ لیسی کی عادت پڑ جاتی ہے"؎

اس دور کی عدالتوں پر بھی انھوں نے مضامین لکھے۔ کیونکہ برطانوی حکومت نے اس روایتی عدالتی نظام کو بھی ختم کر دیا تھا۔ جو کہ ہندوستان میں عرصہ قدیم سے رائج تھے اور ہندوستان کا وہ قدیم عدالتی نظام اس رسم و رواج پر مبنی تھا جو قدیم زمانہ سے ملک میں چلے آرہے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے قوانین شاستر اور شریعت کے ضابطوں پر نیز شاہی فرمانوں پر مبنی تھے۔ گرچہ کسی حد تک انگریزوں نے انھیں جاری رکھا تھا۔ خواہ اچھے ہوں یا برے انھیں قوانین کے تحت ہندوستانی عوام کو رہنا تھا۔ ان پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ وہ خدائی قوانین سمجھے جاتے تھے اور ان کا احترام سب پر لازمی تھا۔ ان قوانین سے عام جنتا کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور عدالتیں کس طرح اپنے کارنامے انجام

دے رہی تھیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے پریم چند لکھتے ہیں

"عدالتوں کا اثر اس سے کم
نقصان دہ نہیں ہے۔ وہاں مقدمہ بازی کرنے والی جنتا اور ان کا
دھن لوٹنے والے وکیل مختار دونوں ہی اپنی روح کو کچلتے ہیں۔ اگر
کوئی آدمی جھوٹ، چھل کپٹ بے ایمانی کا زبردست ناٹک دیکھنا
چاہے تو ایک بار اسے عدالت میں جانا چاہئے۔ کہیں گواہ تیار کئے
جارہے ہیں۔ کہیں موکلوں کو انکا بیان طوطے کی طرح رٹایا جارہا ہے۔
کہیں کمائیاں محرر موکلوں سے خرچ کے لئے تکرار کر رہا ہے۔ کہیں کرمچاری
لوگ رشوت کے سودے چکا رہے ہیں ..... اور یہ سب تماشا
کھلم کھلا بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ہوتا رہتا ہے"[۹]

پریم چند کا سوراجیہ کا تصور بہت صاف ستھرا تھا۔ وہ آزاد ہندوستان میں غریبوں، دلتوں، پسماندہ طبقوں، کسانوں اور مزدوروں کو خوشحال دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے سوراجیہ آندولن کو غریبوں کا آندولن کہا ہے کیونکہ سوراجیہ سے زیادہ تر غریبوں اور کمزور طبقوں کو فائدہ پہونچے گا۔ اس کے لئے پریم چند مزدور اور کسانوں کو متحد ہوکر سامراجیت کے خلاف جدوجہد کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ مزدور اور کسان متحد ہوکر جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون "ورنشان آندولن کے راستے میں رکاوٹ" میں لکھا تھا کہ

"انھیں اس کی خبر نہیں ہے
کہ جمہوریت کا طوفان بہت جلد ان کے پھیلے ہوئے بڑے بڑے محلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے دکھ دیگا
اور آگے چل کر ان کی حیثیت اقتصاف اور سچائی پر قائم رہے گی۔ سرکار انکی کتنی ہی حمایت
کرے مگر جمہوریت کے طوفان کو روک نہیں سکتی دنیا نے اسکے آگے سر جھکا دیئے ہیں

> یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ مزدور اور کسان ایک ہوکر جو چاہیں کرسکتے ہیں۔ ان کی طاقت اسیم ہے۔ وہ جبتک بکھرے ہوئے ہیں گھاس کے ٹکڑے ہیں۔ ایک ہوکر جہاز کھیچنے والی رسی ہوجائیں گے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ سرمایہ دار ۹۵ فیصدی منافع بانٹ لیں اور مزدوروں کو زندگی کی ضرورتیں بھی نصیب نہ ہوں۔ وہ ہوا اور روشنی سے بھی محروم رہیں۔ سرمایہ دار پیرس اور لندن کی سیر کریں اور مزدور کو صبح سے شام تک سر اٹھانے کی فرصت نہ ملے۔ اس کی کمائی نذرانے، بیگار، ہاڑی ڈانڈ وغیرہ کی صورتوں میں زمینداروں کے لئے عیش کا سامان مہیا کریں۔ اب وہ زمانہ بھی دور نہیں ہے کہ جب سرکار کی طرف سے انھیں ناامید ہونا پڑے گا۔ انکی بھلائی کانگریس کی مخالفت کرنے میں نہیں بلکہ ان کا ساتھ دینے میں ہے۔ بہرحال ان طبقوں سے کانگریس کی مخالفت بہت زیادہ ہے اور سوراجیہ کی تحریکوں میں روڑے اٹکانا ثابت شدہ بات ہے۔

پریم چند کا یہی وہ طبقاتی شعور تھا جس کے لئے وہ زندگی بھر جدوجہد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تحریک آزادی میں گاندھی جی کے شامل ہونے کے بعد ان سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ لیکن بعض جگہوں پر وہ گاندھی جی سے بھی غیر مطمئن نظر آتے ہیں البتہ کانگریس کے ساتھ وہ آخر وقت تک جڑے رہے اور آزاد ہندوستان کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ ان کا آزادی کا تصور بہت صاف ستھرا تھا۔ وہ استحصال اور لوٹ مار کے سخت مخالف تھے۔ چاہے اسکی شکل تجارتی کیوں نہ ہو۔ وہ آزاد ہندوستان کو سرمایہ داریت جاگیرداریت اور پونجی واد کے راستہ سے بالکل الگ رکھنا چاہتے تھے تاکہ اس ملک کے عوام (خواہ وہ کسی بھی فرقے یا طبقے سے تعلق رکھتے ہوں) دوسرے ترقی پذیر ممالک کے عوام کی طرح لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہیں اور اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرسکیں۔ یہی وہ نظریہ تھا جس کے لئے پریم چند پوری زندگی لڑتے رہے۔

پریم چند ایک حساس ادیب تھے اس لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے ملک کی سماجی و سیاسی تحریکات سے متاثر نہ ہوتے۔ ان کے دل میں بھی آزادی کے جذبات موجزن تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں تحریک آزادی سے متعلق موضوع کی عکاسی ہوتی ہے۔ انھوں نے خود بھی اپنی تخلیقات کا مقصد حصول آزادی قرار دیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ سرکاری ملازمت تھے اور اپنے خیالات وجذبات کے اظہار میں حد سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان کی تخلیقات میں حصول آزادی کے جذبات صاف نظر آتے ہیں۔ ہر چند کہ ان پر پابندیاں عائد کر دی گئیں تھیں لیکن انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ سچا محب وطن ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ انکی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" ۱۹۰۸ء ہے۔ جو انگریزی سرکار کے لئے اس قدر پریشانی کا باعث بن گیا تھا کہ ان پر آئندہ نہ لکھنے کی پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ لیکن پریم چند نام بدل کر اپنے خیالات وجذبات کا اظہار کرتے رہے۔ بقول ڈاکٹر جعفر رضا۔

> " پریم چند اپنے وقت کی سیاسی کشمکش کی تصویر کشی کرتے ہوئے وہ اس کے شکار نہیں ہوئے بلکہ وہ ادب کا مقصد حصول آزادی قرار دیتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ ہندوستانی عوام جلد جلد آزادی میں کامیاب ہوں۔ یہی خیالات ان کے شہپاروں میں نظر آتے ہیں۔ ان کو یہ سعادت حاصل ہے کہ انکے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" سیاسی تحریک کو آگے بڑھانے میں اور جذبہ حریت کو مہمیز کرنے کے خوشگوار الزامات میں غیر ملکی حکمرانوں کے ذریعہ ضبط کیا گیا۔ اور اس کی تمام کاپیاں نذر آتش کرا دی گئیں۔"[۱۱]

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پریم چند پر تحریک آزادی کا زبردست اثر پڑا اور وہ اس تحریک میں شروع سے ہی شریک تھے اور ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد حصول آزادی

ہی تھا جس کے حصول کے لئے انھوں نے پوری زندگی وقف کردی۔ ملک کی تحریک آزادی سے وہ اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ سرکاری ملازمت بھی ترک کردی۔ ملکی تحریکوں کا اثر ان کی تحریروں میں صاف طور پر نمایاں ہے۔ بقول ہنس راج رہبر:

> "پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں کا مطالعہ اگر سلسلہ وار کیا جائے تو ۳۶ سال کی ہماری "قومی زندگی اور تحریک آزادی کی نفسیاتی" تاریخ مرتب ہوجاتی ہے۔۔۔۔۔ اور اس دور کے سبھی اہم واقعات، سیاسی و نظریاتی تبدیلیاں پریم چند کی نفسیات میں بدرجہ اتم منعکس ہوتی ہیں۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تحریک آزادی کا ارتقا پریم چند کے شعور اور فن کا ارتقا ہے انھوں نے اپنی انفرادی زندگی کو پوری طرح قومی زندگی سے ہم آہنگ کردیا تھا۔ اور انفرادی جدوجہد کو اجتماعی جدوجہد کا روپ دیدیا تھا۔"

یہیں بیان پر تحریک آزادی میں پریم چند کے رول کو سمجھنے کے لئے کانگریس کی قیادت اور پریم چند کے سیاسی عقائد کو سمجھنا بھی ضروری ہوگا۔ تقسیم بنگال کے خلاف جب سودیشی اور بائیکاٹ کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ اس وقت "تلک" جیسے رہنما ہندوستانی سیاست پر چھائے ہوئے تھے اور کانگریس کے اندر دو گروپ بھی سامنے آچکے تھے۔ اس وقت پریم چند کی ہمدردی "تلک" کے گرم دل کے ساتھ تھی۔ گرچہ شروع شروع میں وہ گوکھلے سے ضرور متاثر تھے لیکن دھیرے دھیرے وہ "تلک" کے عقائد کی طرف مائل ہونے لگے۔ کیونکہ پریم چند نے سمجھوتہ پرستی کو کبھی پسند نہیں کیا۔ اس لئے لبرل پارٹی کے وہ ہمیشہ خلاف رہے۔ وہ گاندھی جی سے پہلے "تلک" کے مداح تھے۔ منشی دیانرائن نگم رقمطراز ہیں۔

> "پریم چند کا سیاسی میلان گرم دل کی طرف تھا۔ احمدآباد کانگریس دیکھنے ہم لوگ ساتھ ہی

ساتھ گئے اور ایک ہی جگہ ٹھہرے۔ لیکن وہ "مسٹر تلک" کے طرفدار
تھے اور میں مسٹر گوکھلے اور فیروز شاہ مہتہ کا حامی تھا۔ ہر وقت بحث
رہتی تھی مگر دونوں اپنی جگہ قائم رہے [۱۱]

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کانگریس کی سمجھوتے
کی پالیسی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ کڑی جدوجہد کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا اور اس کے لئے وہ
عوام کو تیار کرنا چاہتے تھے کیونکہ حکومت سے ٹکرلئے بغیر کوئی کامیابی حاصل ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ جزوی اصلاحات کو
وہ ناکافی سمجھتے تھے۔ اصلاحات سے متعلق ان کا نظریہ دیانرائن نگم کے نام ۲۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کے خط سے واضح
ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میں ریفارم اسکیم یا ایکٹ کے
مسٹر چنتامنی وغیرہ سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال سے معتدل پارٹی اس
وقت ضرورت سے زیادہ مغرور اور نازاں ہے۔ حالانکہ اصلاحوں
میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہ کہ تعلیم یافتہ جماعتوں کو کچھ
آسانیاں زیادہ مل جائیں گی۔ جس طرح یہ جماعت وکیل بنکر رعایا
کا خون پی رہی ہے اسی طرح اور حاکم بنکر رعایا کا گلا کاٹے گی۔ اس
کے سوا اور کوئی جدید اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ ان میں بھی اتنی شرطیں
لگادی ہیں کہ ان کا دینا نہ دینا برابر ہوگا" [۱۲]

جنگ آزادی کی تحریک ۱۹۲۰ء تک پہونچتے پہونچتے شہروں سے نکل کر
اب گاؤں کے دور دراز علاقوں تک پہونچ چکی تھی۔ اور اس وقت تک گاندھی جی جیسے رہنما افریقہ سے واپس آئے۔
کے بعد تحریک آزادی میں شریک ہو چکے تھے۔ اس وقت کانگریس پارٹی گاندھی جی کی قیادت میں آگے بڑھ رہی تھی
گاندھی جی نے خود بھی کانگریس میں شامل ہونے کے بعد ہندوستان کی آزادی اور ملک کے سیاسی حالات کو

دیہاتوں تک پہونچانا شروع کر دیا جس کی وجہ سے گاؤں اور دیہاتوں کے لوگوں میں اہمیت کا احساس ہوا اور دیہاتیوں کا سیاسی شعور بھی ابھرا۔ بریم چندنے خود بھی گورکھپور کے قیام کے دوران گاندھی جی کے خیالات سے متاثر ہو کر ہی عدم تعاون کی تحریک کی حمایت کی اور نوکری سے استعفیٰ دیدیا۔ شیورانی دیوی سے گفتگو کے دوران بریم چند کہتے ہیں کہ

"مہاتما گاندھی کا طرفدار نہیں بلکہ میں ان کا چیلا تو اسی وقت ہو گیا تھا جب وہ گورکھپور میں آئے تھے۔ دنیا میں مہاتما گاندھی کو میں سب سے بڑا مانتا ہوں۔ ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ مزدور اور کاشتکار سکھی ہوں اور وہ ان لوگوں کو آگے بڑھانے کے لئے آندولن چلا رہے ہیں اور میں لکھ کر ان کا حوصلہ بڑھا رہا ہوں۔ مہاتما گاندھی بھی ہندو اور مسلمانوں کی ایکتا چاہتے ہیں تو میں ہندی اور اردو کو ملا کر ہندوستانی بنانا چاہتا ہوں"[۵]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی میدان میں گاندھی جی کے آنے کے بعد بریم چند نے ان کے نظریات کو قبول کیا جسکا اعتراف کرتے ہوئے بریم چند کے لڑکے امرت رائے نے لکھا ہے کہ "عملی میدان میں گاندھی جی اور ان کے درمیان استاد اور شاگرد کا رشتہ تھا"[۶] اب بریم چند گاندھی جی کے خیالات کو گاؤں اور دیہاتوں میں پھیلانے لگے تھے۔ نوکری سے مستعفی ہونے اور اپنے آبائی گاؤں واپس آنے کے بعد گاندھی جی کے پروگرام کو فروغ دینے کے لئے انھوں نے چرخے کی تجارت بھی شروع کی اور دیہاتیوں کے مسائل کو دور کرنے کے لئے جج کا وقت بھی مقرر کیا۔ روزانہ ان کے مسائل کو سنتے اور ستیہ گرہ کی اہمیت بتاتے اور ملک کی آزادی کے پروگراموں سے بھی روشناس کراتے۔ انھوں نے گاؤں میں مفت چرخے بھی تقسیم کروائے اور ان کے استعمال کی تربیت اور اسکی اہمیت سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ دیہاتیوں کے حالات جاننے کے لئے وہ خود بھی گاؤں کا دورہ کرتے اور ان کے مسائل کو سمجھتے اور اپنے خیالات پیش کرتے تھے۔

پریم چند کانپور آنے کے بعد کانگریس میں شامل ہوئے اور شامل ہونے کے بعد انھوں نے کانگریسی کارکنوں کے ساتھ دیہاتوں کا دورہ شروع کیا۔ اور لوگوں پر ہونے والے مظالم، حکومت کا جبر و ستم، زمینداروں کی زیادتیاں اور اچھوتوں کے سماجی مقام وغیرہ جیسے مسائل کو سنتے اور ان سے نجات کرنے کے طریقے بھی بتاتے۔ کانگریس کے اندر انھوں نے کسان اور مزدوروں کو بھی شامل کیا اور حب الوطنی کے خیالات سے ان کے دلوں کو گرم کیا۔ پریم چند کے گاندھی جی کے تصور آزادی سے متاثر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ گاندھی جی جن ہتھیاروں اور جن لوگوں کے لئے انگریزوں سے لڑ رہے تھے۔ وہی کام پریم چند اپنے قلم کے ذریعہ انجام دے رہے تھے۔ بلکہ ایسا بھی نہیں ہے کہ پریم چند ہر جگہ گاندھی جی کے خیالات سے اعتراف کرتے ہیں بلکہ بعض جگہوں پر انھوں نے اختلاف بھی کیا ہے۔ امرت رائے نے پریم چند کے شاگرد "من منو ناتھ گپت" کے حوالہ سے لکھا ہے

> "جس وقت گاندھی جی نے
> چوری چورا واقعہ کے بعد ان کو آپریشن آندولن واپس لے لیا
> اس وقت انکے اس اقدام کو ٹھیک نہیں سمجھا اور اسی زمانہ میں انھوں
> نے "سوراجیہ کے خطرے" نام سے دیباچہ لکھا جس میں انھوں نے
> پورن سوراج کو ہندوستان کی آزادی قرار دیا"[۱۷]

۱۹۲۰ء تک ملک کی سیاست اور سماج کے تقریباً ہر شعبہ میں گاندھی جی کی شخصیت خیالات اور اس کے اثرات نظر آنے لگتے ہیں۔ انھیں ملک کا سب سے بڑا قومی رہنما ہونے کا فخر حاصل ہے۔ "پنڈت جواہر لال نہرو" مولانا ابوالکلام آزاد اور سبھاش چند بوس جیسے عظیم رہنما بھی ان کے خیالات سے شروع میں متفق تھے لیکن ان لوگوں نے بھی گاندھی جی سے کئی موقعوں پر اختلاف کیا ہے۔ پریم چند گاندھی جی کے کارناموں اور ان کی قیادت کا اعتراف کئی موقعوں پر کیا ہے۔ ۱۹۳۰ میں جب نمک ٹیکس کے خلاف احتجاج اور نمک کا قانون توڑنے کے لئے گاندھی جی نے "ڈانڈی مارچ" شروع کیا تو پریم چند

نے اپنے مضمون آزادی کی لڑائی میں لکھا

"پہلے کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ مہاتما گاندھی کیا کرنے جارہے ہیں۔ مذاق بھی اڑایا گیا۔ ایک گورنر نے تو اپنے خوشامدی ٹٹوؤں کو جمع کرکے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے اس سنگرام کو المناک حادثہ بنایا...... ہم تو مہاتما جی کے سوجھ بوجھ کے قائل ہیں۔ جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔ نہ معلوم کہاں سے نمک قانون کھوج نکالا کہ اس نے دیکھتے دیکھتے ملک بھر میں آگ لگا دی۔ کوئی ایسا ٹیکس نہیں جو غریب سے غریب عوام سے نہ وصول کیا جاتا ہو اور نہ ہی ایسا کوئی دوسرا ٹیکس ہے جس کی اسمبلی میں مخالفت نہ کی گئی ہو۔ انگریزی راجیہ سے پہلے بھارت میں یہ ٹیکس کبھی بھی نہیں لگایا گیا۔ آج بھی دنیا بھر میں بھارت ایسا ملک ہے جہاں پر نمک ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ مسلم قانون میں نمک ہوا اور پانی وغیرہ پر ٹیکس لگانا غیر مذہبی قرار دیا گیا ہے۔ ۱۵۰ سالوں سے ہم یہ ٹیکس دیتے چلے آئے ہیں جو کہ لاگت کا دس گنا ہے۔ سارے لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوکر اسکو توڑ سکتے ہیں اور سرکاری نمک بازار سے نکال کر باہر کرسکتے ہیں۔"[۱۵]

نمک ستیہ گرہ کے پیچھے دراصل ہندوستانی عوام کا جذبہ آزادی کام کررہا تھا۔ اگر لوگوں کے اندر یہ تڑپ نہ ہوتی تو ہزاروں لاکھوں لوگ اس میں شریک نہیں ہوتے۔ پریم چند کے دل میں بھی یہی تڑپ تھی جو انکے قلم کو جنبش دیتی ہے۔ وہ مہاتما گاندھی کی اس تحریک کی حمایت میں مضامین لکھتے ہیں۔ خلافت تحریک اور ترک موالات کا بھی انھوں نے استقبال کیا۔

پریم چند گاندھی جی کی ہر اس تحریک کا ساتھ دیتے ہیں جس میں ان کو سماجی

انصاف اور ظلم و استحصال سے ہندوستانی عوام کی نجات نظر آتی ہے۔ لیکن جب وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ گاندھی جی کے نظریات اور اقدامات بعض مسائل کی جڑوں تک پہونچنے سے قاصر ہیں اور ان کے ستیہ گرہ یا اصلاحی اور تعمیری کاموں کے طریقہ کار سے مسائل کا حل ہوتا نظر نہیں آتا ہے تو وہ دھیرے دھیرے دور ہٹتے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ پریم چند کافی عرصہ تک گاندھی جی کے اثرات کے تحت لکھتے رہے اور ان کا ساتھ دیتے رہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ گاندھی کے ہر خیالات کو پسند کرتے تھے۔ بلکہ بعض مقامات پر جیسا کہ اوپر ذکر کیا ہے ان سے اختلاف بھی کیا ہے۔ گاندھی جی کے برعکس سرمایہ دارانہ سماج کے مقابلہ میں سوشلسٹ سماج کو آخری وقت ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "بیسویں صدی سیکولرزم کی صدی ہے۔ جو ممکن ہے آگے چل کر کمیونزم کی شکل اختیار کرلے۔ بھارت جیسے ملک میں جہاں آبادی کا بڑا حصہ غریبوں کا ہے۔ جنہیں بڑے ان پڑھ سبھی قسم کے لوگ ہیں۔ سوشلزم کے سوا ان کا کوئی آدرش ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ اگر آج کانگریس پارٹی کا ریفرنڈم کرایا جائے تو میرا خیال ہے کہ اکثریت سوشلزم کی ہوگی اور اس کے ایک ہی دو قدم پیچھے کمیونزم نظر آئے گا۔ ایسی تنظیم محض اس خوف سے کہ مٹھی بھر سرمایہ داروں کا تعاون اسکے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اپنے آدرشوں کو تیاگ نہیں سکتی ہے پنڈت جواہر لال نہرو سوشلسٹ ہیں۔ کانگریس میں بھی سبھی لوگ چاہے بچارے ہوں یا نہ ہوں یہ خیالات سے ضرور ہیں اور سوشلسٹ جائداد والوں کا کبھی دوست نہیں ہوسکتا ہے چاہے دشمن نہ ہو۔" [۱۹]

پریم چند دھیرے دھیرے گاندھی جی کے خیالات سے دور ہوتے جارہے تھے۔ اس زمانہ میں لکھے ہوئے اپنے کئی مضامین میں انھوں نے گاندھی جی کے خیالات سے اختلاف کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ جیسے جیسے گاندھی جی سے دور ہوتے جارہے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور

سبھاش چندر بوس وغیرہ کے سماج واد سے قریب ہوتے جارہے تھے۔ وہ جواہر لال نہرو کی "قائم کردہ" سوشلسٹ کانگریس سے بھی متاثر ہوئے اور نظریاتی طور پر ان سے قریب آئے۔ ان پر یہ بات صاف ظاہر ہو چکی تھی کہ سماج اور اس کے تمام اداروں کی بنیاد اقتصادی نظام پر ہے جسے بدلے بغیر سماج میں کسی تبدیلی کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے مضمون "قومیت اور بین الاقوامیت" میں لکھتے ہیں

"انسانی سماج کی تنظیم شروع سے ہی اقتصادی بنیاد پر ہوتی ہے۔ جس وقت انسان غاروں میں رہا کرتا تھا اس وقت بھی اسے خوراک کے لئے گروہوں میں رہنا پڑتا تھا اور ان گروہوں میں بھی آپس میں جنگ ہوتی تھی۔ اس وقت سے آج تک اقتصادی وصول ہی دنیا کی رہبری کرتے آئے ہیں۔ جب تک ملکیت انسانی سماج کے تشکیل کی بنیاد بنی رہے گی۔ اس وقت تک بین الاقوامیت کا آغاز ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ جب تک ملکیت پر شخصی قبضہ رہے گا اس وقت تک انسانی سماج کا بھلا نہیں ہو سکتا ہے"

پریم چند کی اس ذہنی تبدیلی اور گاندھیائی تصور برہنی سے انحراف کا سراغ اس دور کی کم و بیش تمام تحریروں میں ملتا ہے اس سلسلہ میں ان کا سب سے اہم مضمون "مہاجنی تہذیب" ہے۔ جس میں انھوں نے بڑی وضاحت اور کھلے دل سے سماج واد اور اس کی لائی ہوئی تہذیب کا خیر مقدم کیا ہے۔ اور آج کل کی تمام خرابیوں کا سارا الزام نفع خوری کی حرص پر عائد کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"اس مہاجنی تہذیب میں سارے کاموں کی غرض محض پیسہ ہوتی ہے۔ کسی دیس پر راج کیا جاتا ہے تو اس لئے کہ مہاجنوں اور سرمایہ داروں کو زیادہ سے زیادہ نفع ہو۔ اس نقطہ نظر سے دیکھو تو آج دنیا میں سرمایہ داروں کی حکومت

ہے۔ انسانی معاشرہ دو طبقوں میں بٹ گیا ہے۔ بڑا حصہ مرنے اور کھپنے والوں کا ہے اور چھوٹا حصہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اپنی طاقت اور اثر سے بڑے طبقہ کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ انھیں اس بڑے طبقہ سے کسی طرح کی ہمدردی نہیں ہے۔ ذرا بھی رو رعایت نہیں۔ بڑے طبقہ کی ہستی صرف اسلئے ہے کہ وہ اپنے آقاؤں کے لئے پسینہ بہائے خون گرائے اور ایک دن چپ چاپ اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔"[۲۲]

"ایک دور دراز ملک میں نئے تمدن کے قیام پر پریم چند کو نوع انسانی کے لئے کئی امیدیں پیدا ہوتی نظر آنے لگی تھی اور اس کا خیر مقدم انھوں نے کچھ اسطرح کیا ہے۔

"ایک نئی تہذیب کا سورج دور مغرب سے طلوع ہو رہا ہے۔ جس نے اس سرمایہ داری کی جڑ کھود کر پھینک دی ہے۔ جسکا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے جسم و دماغ سے محنت کر کے کچھ پیدا کر سکتا ہے۔ حکومت اور سماج کا قابل احترام رکن ہو سکتا ہے۔ اور جو صرف دوسروں کی محنت یا باپ دادا کے جوڑے ہوئے دھن پر رئیس بنا پھرتا ہے وہ قابل نفرت انسان ہے۔ اسے نہ تو معاملات حکومت میں رائے دینے کا حق ہے اور نہ شہریت کے حقوق لینے کا۔ سرمایہ دار اس نئی لہر سے بوکھلایا ہوا پھر رہا ہے اور ساری دنیا کے سرمایہ داروں کی مشترکہ آواز اس نئی تہذیب کو کوس رہی ہے"[۲۳]

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پریم چند ملک کی آزادی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ وہ مزدوروں اور کسانوں کی فلاح کے لئے ہمیشہ کام کرتے رہے اور کانگریس کے

ساتھ وہ آخر وقت تک قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے گو کہ اس بعض پالیسیوں سے اختلاف بھی رہا ہے لیکن سیاسی تحریک سے کبھی دامن نہیں کھینچا اور ادیب کے منصب سے بھی کبھی غافل نہیں رہے۔ سجوتے اور سنگھرش کی سیاست میں انھوں نے سنگھرش کا ہی ساتھ دیا ہے اور ایک سچے محب وطن کی حیثیت سے اپنے دور کی ہر سیاسی تحریکات کا ساتھ دیا۔ وہ آخر وقت تک اپنے آدرش پر قائم رہتے ہوئے برطانوی غلامی سے ملک کو آزاد کرانے کی کوشش کرتے رہے۔

حوالہ جات

۱۔ سجاد ظہیر ۔ روشنائی ۔ ص ۔ ۸۵

۲۔ ڈاکٹر بی پٹابھائی سیتا رامیہ ۔ تواریخ کانگریس ۔ ص ۔ ۲

۳۔ ڈاکٹر بی پٹابھائی سیتا رامیہ ۔ تواریخ کانگریس ۔ ص ۔ ۲۸۵

۴۔ تارا چند ۔ تاریخ تحریک آزادی ہند ۔ ص ۔ ۸۲

۵۔ امرت رائے ۔ مرتب ، پریم چند وودھ پرسنگ ۔ ص ۔ ۷۶

۶۔ ہنس راج رہبر ۔ پریم چند ۔ ص ۔ ۱۹۹

۷۔ ڈاکٹر کمل کشور گوینکا ۔ پریم چند وشوکوش ۔ ص ۔ ۱۷۷

۸۔ ڈاکٹر کمل کشور گوینکا ۔ پریم چند وشوکوش ۔ ص ۔ ۱۷۵

۹۔ ڈاکٹر کمل کشور گوینکا ۔ پریم چند وشوکوش ۔ ص ۱۷۵

۱۰۔ امرت رائے ، مرتب پریم چند وودھ پرسنگ جلد دوئم ۔ ص ۔ ۲۹

۱۱۔ جعفر رضا ۔ پریم چند کہانی کا رہنما ۔ ص ۔ ۲۷۹

۱۲۔ پریم چند نمبر ۔ جنوری شیرازہ ۔ جنوری ، فروری ، مارچ مضمون ، پریم چند اور تحریک آزادی ۔ ہنس راج رہبر ۔ ص ۔ ۶

۱۳۔ دیا نرائن نگم ۔ مضمون ۔ پریم چند کا تصورات ۔ پریم چند شخصیت اور کارنامے ۔ مرتب ، قمر رئیس ۔ ص ۔ ۱۷۳

۱۴۔ امرت رائے ۔ پریم چند جیونی بیتری ۔ ص ۔ ۹۳

۱۵۔ شیورانی دیوی ۔ پریم چند گھر میں ۔ ص ۔ ۷۸

۱۶۔ امرت رائے ۔ پریم چند کی پراسنگکتا ۔ ص ۹۷

۱۷۔ امرت رائے ۔ پریم چند کی پراسنگکتا ۔ ص ۔ ۹۰

۱۸۔ امرت رائے ۔ پریم چند وودھ پرسنگ ۔ جلد دوئم ۔ ص ۔ ۷۶

۱۹۔ امرت رائے ۔ پریم چند وودھ پرسنگ ۔ جلد دوئم ۔ ص ۔ ۲۱۷

۲۰ امرت رائے ۔ پریم چند وودھ پرسنگ ۔ جلد دوئم ۔ ص ۔ ۳۴۳ ۔ ۳۴۴

۲۱ ڈاکٹر کنور پال سنگھ ۔ مرتب ۔ پریم چند اور جنوادی ساہتیہ کی پرمپرا ۔ ص ۔ ۳۶

۲۲ ڈاکٹر کنور پال سنگھ ۔ مرتب ۔ پریم چند اور جنوادی ساہتیہ کی پرمپرا ۔ ص ۔ ۳۱

باب چہارم

"میدان عمل" میں تحریک آزادی کے اثرات

(۱) "میدان عمل" کا فن

(۲) "میدان عمل" کا موضوع

(۳) "میدان عمل" کے کرداروں میں سماجی و سیاسی شعور

(۴) کرداروں میں تحریک آزادی کی کشمکش — نتائج

میدان عمل پریم چند کی ایک اعلیٰ تصنیف ہے جس کا موضوع ہندوستان کی جدوجہد تحریک آزادی ہے۔ امرت رائے نے "میدان عمل" کی تصنیف اور اشاعت کے بارے میں لکھا ہے۔

"میدان عمل ۱۶ اپریل ۱۹۳۱ء سے
آرمبھ ہوا اور سماپتن ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ دلتیں کے سوادھینتا آندولن
کی کہانی ہے۔ جس میں لیکھک نے گہرائی میں بیٹھکر ساما جک وشلیشن
کیا ہے۔" ۱

میدان عمل کی تصنیف اور اشاعت کے بارے میں اختلاف ہے۔ مدن گوپال کے خیال میں "پریم چند نے ۱۹۳۲ء میں میدان عمل کی تصنیف کی" ۲ ڈاکٹر کمل کشور گوینکا مدن گوپال کے خیال سے اتفاق کرتے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں۔

"پریم چند نے "کرم بھومی" ۱۹۳۲ء میں تصنیف کی
اور ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ مکتبہ جامعہ سے شائع ہوئی" ۳

ڈاکٹر قمر رئیس نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "پریم چند نے یہ ناول ۳۲-۱۹۳۰ میں لکھا اور اپنے ذاتی مطبع سرسوتی پریس سے طبع کرا کے شائع کیا" ۴

ان متضادات بیان سے قطع نظر بہرحال یہ حقیقت ہے کہ یہ ناول

اس وقت لکھا گیا جب ہندوستان میں سیاسی کشمکش زوروں پر تھی۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے افق پر مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو، بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے، بپن چندر پال، موتی لال نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے عظیم رہنما چھائے ہوئے تھے۔ نظریاتی طور پر اس وقت کانگریس دو گروہوں میں منقسم تھی جیسا کہ پچھلے باب میں کہا گیا۔ ایک نرم دل کے نام سے جانا جاتا تھا جس کے سربراہ گاندھی اور نہرو تھے جو مفاہمت پسندی پر زور دیتے تھے۔ دوسرا دل گرم دل کے نام سے مشہور تھا جسکی سربراہی لالہ لاجپت رائے کر رہے تھے۔ یہ گروہ مفاہمت پسندی کے خلاف تھا۔

۱۹۲۸ء کے قریب سیاسی جدوجہد اور بھی شدت اختیار کر گئی۔

اسی سال "سائمن کمیشن" آیا۔ جس کا مکمل طور پر بائیکاٹ کیا گیا۔ اس کے خلاف پورے ملک میں جلوس نکالیں اور مظاہرے ہوئے اور سائمن کمیشن واپس جاؤ کی آواز سے ہندوستان کی سیاسی فضا گونج اٹھی۔ حکومت نے اس کو سختی سے دبانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ پرامن مظاہروں پر بھی لاٹھی چارج کیا گیا جس کے نتیجہ میں لالہ لاجپت رائے جیسے معمر لیڈر کی موت واقع ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد لڑائی کے آثار پورے ملک میں تیزی کے ساتھ پھیل گئے۔ ۱۹۳۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے لاہور اجلاس میں پورن سوراج کی مانگ کی گئی۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو پورے ملک میں یوم آزادی بڑے جوش و خروش کے ساتھ منائی گئی۔ اور اب گاندھی جی نے ستیہ اور اہنسا کے اصول پر کاربند رہ کر سول نافرمانی کا اعلان کر کے ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو نمک کا قانون توڑ کر کیا۔ گاندھی جی کی اس تحریک میں ہندو مسلم، مرد عورت سبھی لوگوں نے بھرپور حصہ لیا۔ حکومت نے ظلم و استبداد اور تیز کر دیئے۔ لیکن ستیہ گرہ اور سول نافرمانی کی یہ تحریک حیرت ناک حد تک شدت اختیار کر گئی۔ بعد میں گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے ۱۹۳۱ء میں لندن گئے اور مایوس ہو کر واپس ہندوستان لوٹ آئے۔

یہی وہ سیاسی حالات تھے جس کے پس منظر میں پریم چند نے میدان عمل لکھا۔ ان سیاسی و سماجی حالات کو سامنے رکھکر اگر میدان عمل کا مطالعہ کیا جائے تو اس سیاسی بحرانی اور جدوجہد آزادی کی فضا پورے میدان عمل میں نظر آئے گی۔

پریم چند کا ناول میدان عمل کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے

غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض عالموں نے اس ناول کو پریم چند کے بہترین ناولوں میں شمار کیا ہے۔ ان کے نزدیک میدان عمل میں وطن پرستی کی لو اور سماج کو بدلنے کا جذبہ نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے خیال میں اس ناول سے پریم چند کی فکر نئی منزل کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"پریم چند کے خیالات کا دھارا
ایک نئی سمت میں مڑ رہا تھا۔ وہ مہاتما گاندھی کی عوام دوستی
اور ان کے اعلیٰ قومی خدمات کے اب بھی معترف تھے۔ لیکن ان کی
ذہنی نشوونما اب گاندھی واد کی گرفت سے آزادی حاصل کر رہا تھا
اور وہ اسے تنقیدی نظر سے دیکھنے لگے تھے"[۵]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میدان عمل میں پریم چند نے اس سماجی و طبقاتی کشمکش کا تجزیہ کر کے اسے اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ جسمیں قومی تحریک کے بیشتر رہنما شعوری یا غیر شعوری طور پر گرفتار تھے۔ میدان عمل کا مرکزی کردار "امرکانت" نہ صرف گاندھیت کا پرستار ہے بلکہ بغاوت وجدوجہد کی راہ پر گامزن عوام کو رجعت پسندانہ طریقہ کار سے روکتا ہے۔ کیونکہ اس کو اندیشہ ہے کہ اس طرح لوگ عدم تشدد کے تصورات سے الگ ہو جائیں گے۔

اس ناول کا پس منظر تحریک آزادی ہے جس میں اپنے عہد کی تمام سیاسی و سماجی سرگرمیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ناول میں اپنے عہد کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں زندگی کی تعمیر نو کا جذبہ بھی ناول میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جہاں ملک کے مختلف طبقوں اور فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کے دوش بدوش شریک ہیں۔ ڈاکٹر اجیت کمار موہن سنگھ میدان عمل کے بارے میں لکھتے ہیں

"کرم بھومی میں سعادت کے
اس سوادھینتا سنگرام اور جن جاگرتی کے بیاپک پرسار کا انکن

کیا گیا ہے۔ اس آندولن میں ہندو مسلمان کسان، طالب علم،
پروفیسر اچھوت اور اونچ ذات کے لوگ، جوان بوڑھے مائیں
اور بہنیں اور دوکاندار سبھی سنگری روپ سے بھاگ لیتے ہیں۔ سچے
ارتھوں میں جس وشال استر پر یہ آندولن چھیڑا گیا تھا۔ کرم بھومی
اس کی اس بیاپکتا اور گہرائی کا واستوک چتر پیش کرتا ہے" ۵۶

ڈاکٹر رام بلاس شرما نے بھی "میدان عمل" کو جدوجہد
آزادی کی تاریخ کہا ہے۔ جو ایک زبردست سیلاب کی طرح تمام ہندوستانی عوام کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ اور
ہندوستان کی عوام آزادی کی لڑائی میں آگے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں

بہرکیف "میدان عمل" پریم چند کی ایک اہم تصنیف ہے جس میں
ہر طرف حرکت نظر آتی ہے۔ سماجی و سیاسی الفاقی کے اخلاف مظاہرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ناول میں تحریک آزادی کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں
کسان، مزدور، تاجر، نوکری پیشہ لوگ، طالب علم، عورت، مرد، بچے، بوڑھے سبھی سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ "میدان عمل" میں
امیر غریب، نادار، پریشان حال، مجبور، لاچار اور اچھوتوں کے حالات زندگی کی بھی ترجمانی ملتی ہے۔ "میدان عمل" کی
ایک خوبی یہ ہے کہ اس ناول میں آزادی کی تحریک اور شہری زندگی کی کشمکش کے ساتھ چلتی ہوئی نظر آتی ہے
شہری جدوجہد کا محاذ میونسپل انتظامیہ کے خلاف ہے۔ جس میں آگے چل کر کامیابی ہوتی ہے۔ "سلیم" کے والد "حافظ حلیم"
اور "نینا" کی کوششوں سے میونسپلٹی غریبوں اور ضرورت مندوں کو مکان بنوانے کے لئے زمین بھی دیتی ہے۔ گاؤں
میں زمینداری کے خلاف تحریک چلائی جاتی ہے۔ جس کا شکار گاؤں کا ہر کاشت کار ہے۔ مگر زمینداروں کے پنجے اس
قدر مضبوط ہیں کہ یہ تحریک ناکام ہوجاتی ہے۔ میدان عمل بلاشبہ اپنے دور کی سیاسی بیداری کی مکمل عکاسی اور ترجمانی
کرتی ہے۔ سید صفدر علی لکھتے ہیں

" میدان عمل بڑی حد تک کامیاب

ناول کہا جا سکتا ہے۔ اس میں اپنے عہد کی سچی تصویر کشی
ملتی ہے۔ اسمیں اپنے عہد کی تمام سماجی و سیاسی سرگرمیوں کا
مکمل نقشہ ہی موجود نہیں ہے بلکہ سیاسی قوتوں کی رہنمائی بھی کرتی
ہے۔ میدان عمل میں اپنے دور کے انسانوں کی جیتی جاگتی تصویر
نظر آتی ہے۔ اس میں کامیاب ناول کی طرح زندگی کی تعبیر کا
جذبہ ابھر کر سامنے آتا ہے"

میدان عمل کے کردار کے بارے میں آسانی سے یہ کہا جا سکتا ہے
کہ پریم چند نے سارے کردار عصری آگہی کے تناسب کے اعتبار سے تخلیق کئے ہیں۔ اور ان کرداروں کے انتخاب میں انھوں نے عوامی مسائل کو ہی اولیت دی ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے میدان عمل کی کردار نگاری کے بارے میں لکھا ہے

" میدان عمل کے تمام کردار
عمل کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ اور ان کے عمل کا مقصد مزدور
اور کسانوں کو جبر و استحصال کی قوتوں کے خلاف متحد کرنا انھیں اپنے
حقوق کا احساس دلانا اور ان کے اندر طبقاتی مفاد کا ایک واضح
شعور پیدا کرنا اور انھیں اپنی بہتری کے لئے عملی جدو جہد کا راستہ
دکھانا ہے۔ اور ساتھ ہی محنت کش طبقہ کے مسائل سے جس گہری
ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ان کی حقیقت نگاری کے ایک
نکھرے ہوئے تصور کو سامنے لاتا ہے"

میدان عمل کے سارے کردار مجاہد و رہنما نظر آتے ہیں۔ اس
سلسلہ میں پریم چند نے کسی بھی کردار کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ امر کانت، ڈاکٹر شانتی کمار، سکینہ، منی، رانا دیوی اور نینا مجاہد تو تھے ہی۔ سکھدا، سلیم۔ سمر کانت، کالے خاں، پٹھانی یہاں تک کہ لالہ دھنی رام کو بھی ناول کے آخر میں

ایثار و قربانی کی منزل کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے دکھلایا ہے۔

میدان عمل کا مرکزی کردار امرکانت ہے جو کہ ایک رئیس باپ لالہ سمرکانت کا بیٹا ہے۔ وہ بمشکل تعلیم حاصل کر پاتا ہے۔ پورے ناول میں وہ ایک انقلاب کی علامت ہے۔ دوران تعلیم ہی وہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیتا ہے۔ اسکول کی مصروفیات سے فارغ ہو کر وہ چرخہ کاتتا ہے۔ ملک کی سماجی و سیاسی حالات سے بھی وہ بخوبی واقف ہے۔ ظلم و ستم کے خلاف بغاوت کرنے کا جذبہ رکھتا ہے۔ ہندوستانی عوام کی غربت اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم ان کی مایوسی و افسردگی وغیرہ اس کا خون کھولا دیتی ہے اور وہ ان سب کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ ہرچند کہ وہ بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ وہ چاہتا تو عیش و آرام کی زندگی گزار سکتا تھا۔ اس کی شادی بھی بڑے گھر کی لڑکی سکھدا سے ہوتی ہے۔ مگر دونوں کے مزاج میں بڑا فرق ہے۔ سکھدا اپنے خاندانی اور روایتی ذہن کے اعتبار سے شان و شوکت اور عیش پسند ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ امرکانت اس کے باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹائے اور دولت پیدا کرے مگر امرکانت کو یہ باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ اس کے دل میں انسان دوستی کا جذبہ ہے۔ وہ پروفیسر شانتی کمار کے ساتھ ملکی و قومی تحریکات میں حصہ لینا شروع کر دیتا ہے۔ اسی درمیان اس کو سکینہ سے محبت ہو جاتی ہے۔ جس میں اسکی رسوائی بھی ہوتی ہے اور وہ مجبوراً شہر چھوڑ کر ہریجنوں کی بستی "ہردوار" میں پناہ لیتا ہے۔ وہاں وہ اچھوتوں کی بھلائی میں سرگرم ہو جاتا ہے۔ امرکانت ہردوار کے گاؤں میں پہونچ کر پہلا کام اچھوتوں اور کسانوں کے بچوں کے لئے مدرسہ کھولتا ہے اور کسانوں کے مسائل کی طرف توجہ دیتا ہے۔ اور حکومت کی زیادتیوں اور زمینداروں کے مظالم کے خلاف تحریک چلاتا ہے۔

ادھر امرکانت کے گھر سے غائب ہونے کے بعد سکھدا کی زندگی میں بھی بڑی زبردست تبدیلی آجاتی ہے اور وہ شہری زندگی کی قومی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیتی ہے۔ مزدوروں کی تحریک میں حصہ لیتی ہے اور جدوجہد کرتی ہے۔ اچھوتوں کے لئے مندر کے دروازے بھی کھلواتی ہے جو ہندوستان کے لئے زبردست انقلابی قدم تھا۔ ہزاروں سال کی پرانی روایات کے بندھن کو ختم کرانا سکھدا کا ایک زبردست کارنامہ تھا۔ سکھدا میونسپل بورڈ کے محاذ پر بھی کام کرتی ہے اور گرفتار ہو کر جیل جاتی ہے۔

امرکانت اس تحریک کو سکھدا کے جیل جانے کے بعد اور تیز کر دیتا ہے اور وہ بھی اپنے بچپن کے دوست پولیس افسر سلیم کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتا ہے۔ امرکانت اور سکھدا کی گرفتاری کے بعد لالہ سمرکانت کو بھی جوش آتا ہے اور وہ بھی جدوجہد میں کود پڑتے ہیں۔ اور مزدوروں کے جلسہ میں باغیانہ جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیتے ہوئے گرفتار ہو جاتے ہیں۔ انکی گرفتاری سے تحریک میں ایک نئی جان آجاتی ہے۔

یہاں پر پریم چند نے نہ صرف انگریزوں کے خلاف چلائی گئی تحریک کو دکھلایا ہے بلکہ تمام کرداروں کو ایک ساتھ ایک راستہ پر لاکر کھڑا کر دیا ہے جسکا مقصد انگریزی حکومت کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہے۔ کیونکہ یہ ہندوستان کی تحریک آزادی کا وہ دور تھا کہ لوگ انگریزی حکومت اور اسکے بیجا مظالم برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ ہر طرف ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے نظر آرہے تھے اور اس کے لئے وہ کوئی بھی طریقہ اپنانے کے لئے تیار تھے۔

میدان عمل میں پریم چند نے اجتماعی جدوجہد کو پیش کرتے ہوئے اس کے معاشی سماجی اور سیاسی ہر پہلو کو پیش کیا ہے۔ اس جدوجہد کو پیش کرتے ہوئے پریم چند نے محنت کش اور غریب طبقہ کے مسائل کو زیادہ اچھی طرح پیش کیا ہے۔ اس ناول میں پریم چند نے شروع میں ہندوستان کی غریبی پر ہی اپنا دھیان مرکوز کیا ہے۔ اور انھوں نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کی آزادی ان غریبوں کے لئے سب سے پہلے ہے اور آزادی کی لڑائی میں وہ سب سے بڑی طاقت ہیں۔ دوران تعلیم ہی امرکانت اپنے دوست سلیم کے ساتھ گاؤں کی معاشی حالت کا جائزہ لینے کے لئے جاتا ہے۔ اس وقت ان غریبوں کو دیکھ کر اسکی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اور اس کے قومی خیالات اور بھی پختہ ہو جاتے ہیں۔ اس کو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ عملوں اور مہاجنوں کو ان لوگوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے۔ پروفیسر شانتی کمار اسکی بات کا جواب دیتے ہیں

"وہ فرض اور رحم کا بہت دنوں امتحان ہوا اور وہ دونوں بیکار ثابت ہوئے۔ اب تو انصاف کا زور ہے۔ رحم اور فرض تو اختیاری چیزیں ہیں۔ انصاف کا انحصار محض اخلاقی قانون پر نہیں مجلسی قانون پر ہے"[۱]

یہ غریب صرف دیہات تک نہیں ہے بلکہ پریم چند کی نگاہ شہر کے اندر دو قسم کے گھر اور محلے پر بھی پڑتی ہے۔ ایک غریبوں کے دوسرے امیروں کے۔ جب امرکانت سکینہ کی بوڑھی ماں بھٹیانی کو اس کے گھر چھوڑنے کے لئے جاتا ہے تو وہاں کی بدبودار گلیاں اور رہن سہن دیکھ کر گھبرا اٹھتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر کا نام ایک ہے مگر حقیقت میں شہر دو ہیں۔ پریم چند لکھتے ہیں

"گلی میں سخت بدبو تھی۔ گندے نالے کے پانی دونوں طرف بہہ رہے تھے۔ غریبوں کا محلہ تھا اکثر مکان کچے تھے۔ شہر کے بازاروں اور گلیوں میں کتنا فرق ہے۔ ایک پھول ہے خوبصورت پاکیزہ اور خوشبو دار دوسری جڑ ہے کیچڑ اور بدبو سے لپٹی ہوئی"[۱۰]

پریم چند کے مطابق لالہ سمرکانت اور ان جیسے طبقہ کے دوسرے لوگوں کا سکھ چین، عیش و آرام انھیں گندے محلے میں رہنے والے لوگوں کی محنت پر منحصر ہے اگرچہ دولت مند لوگ یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ان کی عیش و عشرت کی زندگی سے دوسروں کی محنت کا بھی کوئی رشتہ ہے۔ سکینہ کا گھر شہر کے اندر رہ رہے ایک غریب کا گھر ہے۔ پریم چند نے اس کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے۔

"دروازہ ایک پردہ کی دیوار میں تھا اس پر ٹاٹ کا ایک پھٹا پرانا پردہ پڑا ہوا تھا۔ دروازہ کے اندر قدم رکھتے ہی ایک آنگن تھا۔ جس میں مشکل سے دو کھٹولے بچھ سکتے تھے سامنے کھپریل کا ایک نیچا سائبان تھا۔ پیچھے ایک کوٹھری تھی۔ جو اس وقت اندھیری پڑی ہوئی تھی"[۱۱]

لیکن ان تنگ راستوں گلیوں اور گندے مکانوں میں بھی آزادی کی تحریک کی ہوا پھیل رہی ہے ہندو مسلمان، مرد عورت، بوڑھے جوان سبھی اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے اور اس جہنمی زندگی سے چھٹکارا پانے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ منی کے مقدمہ میں چندہ دینے کے لئے بھٹیانی بھی اپنی بیٹی سکینہ کی کمائی سے پیسے

ہوئے روپیہ کو دیتی ہے۔ جو کہ انگریزوں کے ہاتھوں برباد ہو چکی ہے اور اپنی بربادی کا بدلہ لینے کے لئے وہ دو انگریزوں کو قتل کر دیتی ہے

میدان عمل میں ہریم چند برابر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہندو اور مسلمانوں کے بنیادی مسائل ایک ہیں۔ اسلئے سب کو مل کر اس کو حل کرنا چاہئے۔ ایک آزاد ہندوستان کی تعمیر نو میں ان کی حیثیت ایک سی ہے۔ میدان عمل میں ہریم چند نے مزدور کسانوں اور طالب علموں کو ایک ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دکھلایا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کیونکہ کئی مرتبہ نوجوانوں نے مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ ملکر انگریزوں کا مقابلہ بھی کیا تھا۔ ۱۹۳۰ء تک کمیونسٹ پارٹی اور مزدور کسان تنظیمیں بھی وجود میں آچکی تھیں۔ جو اپنے مقصد کو لیکر جدوجہد کر رہی تھیں۔ ہریم چند کو بھی ان کی اہمیت کا احساس ہو چکا تھا اور انہوں نے اسکی عکاسی کی ہے۔

سکینہ کا کردار بھی بہت اہم ہے وہ سکینہ جو کہ امیر ماں کی بیٹی ہے۔ امرکانت کا دست نگر بنکر رہنا کبھی پسند نہیں کرتی ہے۔ لیکن اس کے خیال میں بھی تبدیلی آتی ہے اور وہ بھی میدان میں اتر آتی ہے۔ اور مزدوروں کی تحریک میں شامل ہو جاتی ہے۔ گولیوں کی بوچھار میں بھی ہر بچنوں کی ہمت بندھاتی ہے اور ان کی قیادت کرتی ہے۔

منی کی جب عصمت دری ہوئی تھی تو وہ لوٹ کر گھر نہیں جاتی کیونکہ اسے علم ہے کہ اسکی سوسائٹی والے اور گھر کے لوگ اسے قبول نہیں کریں گے۔ ایک دن جب وہ دو انگریزوں کو مار ڈالتی ہے تو اسکی حقیقت کا لوگوں کو پتہ چلتا ہے اور سارے لوگ اس کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کرنے لگتے ہیں۔ عورتوں کی ہمدردی خاص طور پر اس کے ساتھ ہے۔ یہاں پر سکینہ کہتی ہے

"اگر اسکو پھانسی ہو گئی تو میں سمجھوں گی
کہ دنیا سے انصاف اٹھ گیا ہے۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا ہے بلکہ اس نے تو
اپنی ساری بہنوں کا سر اونچا کیا ہے"[۱۲]

سکینہ کے لفظوں میں یہاں پر ہریم چند نے ہندوستانی عورتوں کی

روشن خیالی، اخلاق اوران کی خصوصیات کو پیش کیا ہے۔ ظالم لوگوں کو سزا ملنے پر ایسی خوشی کا اظہار وہی کر سکتی تھی۔ اسلئے کہ غلامی اور نا انصافی کا بوجھ مردوں سے زیادہ عورتوں کو ہی برداشت کرنے پڑتے تھے اس سے پہلے بھی جب امرکانت اور اس کے ساتھی ایک دوسرے کی بیٹھو ٹھونکتے ہوئے گوروں پر فتح پا کر لوٹے تھے۔ تب سکھدا نے ہی امرکانت سے اس عورت کے بارے میں پوچھا تھا جس کے ساتھ فرنگیوں نے منہ کالا کیا تھا۔ تب سکھدا اس کو ڈانٹ کر کہتی ہے۔

"ایک دن جا کر سب کوئی اس کا پتہ
کیوں نہیں لگاتے۔ اسپیچ دیکر ہی اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔"[12]

جیسا کہ ذکر کیا ہے کہ سکھدا بھی امرکانت کی گرفتاری کے بعد اسکی چلائی گئی تحریک میں شامل ہو جاتی ہے اور ڈاکٹر شانتی کمار کے ساتھ مزدوروں کے مکانات کے لئے میونسپل کارپوریشن سے لڑتی ہے اور مزدوروں کے لئے سرمایہ داروں اور حکومت کے خلاف جنگ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سکھدا مزدوروں کے ایک جلسہ میں کہتی ہے۔

"جس زمین پر ہمارا دعوی تھا وہ
وہ لالہ دھنی رام کو دیدی گئی۔ وہاں انکے بنگلے بنیں گے خود غرضوں سے انصاف
کی امید چھوڑ دو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ادنیٰ لوگ ہمارا کیا کر سکتے ہیں۔ انہیں ہماری
طاقت کا ابھی تجربہ نہیں ہوا ہے۔"[13]

سکھدا دن رات محنت کر کے ان کی طاقت کو منظم کرتی ہے۔ وہ انہیں درماندگی اور پسماندگی سے نکال کر خود اعتمادی اور خود شناسی کا راستہ دکھاتی ہے۔ اسکی رہنمائی میں مزدوروں کی کامیاب ہڑتالیں اور مظاہرے دیکھ کر شہر کے حکام بھی چونک پڑتے ہیں۔ سکھدا ان لوگوں کے رہائشی مسئلہ کے حل کے لئے ہڑتال کرا دیتی ہے۔

"دوسرے دن شہر میں اچھی خاصی
ہڑتال تھی۔ مہتر تو ایک بھی کام کرتا نظر نہیں آتا تھا۔ یکے بالوں اور گاڑی بانوں
نے بھی کام کرنا بند کر دیا تھا۔ سبزی اور ترکاری کی دوکانیں بھی

بند تھیں۔ پولیس اور حکام دوکانیں کھلوا رہے تھے اور مزدوروں کو
جبراً کام پر لانے کی کوشش کر رہے تھے ؎

ہڑتال کرنے پر اعلیٰ طبقہ کے لوگ ان بدحال مظلوموں پر ظلم و استبداد اور تیز کر دیتے ہیں۔ حکومت کی مدد سے گولیاں چلوا کر ان کی آواز کو بند کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں خوفزدہ کرنے کے لئے گرفتاریاں کی جاتی ہیں مگر یہ لوگ ظالم اور مکاروں کی ہر چال کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ بے خوف ہو کر گرفتاریاں دیتے ہیں لیکن اپنی ہڑتال کو کسی طرح بھی ختم نہیں کرتے بالآخر سماج کے ٹھیکیداروں کو مجبور ہو کر ان مظلوموں کو مکان بنانے کے لئے آراضی دینے کا اعلان کرنا پڑتا ہے۔ آخر کار سکھدا بھی ہڑتال کرانے کے جرم میں گرفتار کی جاتی ہے۔ گرفتاری کے وارنٹ کی خبر سنکر سکھدا کہتی ہے۔

" جس قوم کی بنیاد بے انصافی پر ہو
اسکی سرکار کے پاس سختی کے سوا اور کیا دوا ہو سکتی ہے۔ لیکن اس
سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تحریک ختم ہو جائے گی۔۔۔۔ مجھے گرفتار کر لیں
ان لاکھوں غریبوں کو کہاں لے جائیں گے جنکی آہوں کا دھواں بادل
بنکر آسمان پر چھایا ہوا ہے۔ یہی آہیں ایک دن آتش فشاں پہاڑ کی
طرح پھٹکر ساری قوم اور قوم کے ساتھ سرکار کو بھی غارت کر دے گی
میرے گرفتار ہو جانے سے چاہے کچھ دنوں کے لئے حکام کے کانوں
میں غریبوں کی آہ و زاری کی آواز نہ پہونچے لیکن وہ دن دور نہیں
جب یہی آنسو چنگاری بنکر اس بے انصافی کو جلا کر خاک کر دیں گی۔
اسی پولس سے وہ آگ روشن ہو گی۔ جس کے کانپتے ہوئے شعلے
آسمان تک کو ہلا دیں گے "[196]

سکھدا کا کردار بہت جاندار ہے۔ وہ ہریجنوں کے رہائش کے مسئلے

اور مزدوروں وکسانوں کی تحریک کی رہنمائی کرتی ہے اور آخر کار ہڑتال کرانے کے جرم میں گرفتار کر لیجاتی ہے اس ناول میں ہمارے سامنے حیرت ناک کرداروں کا ایک سلسلہ گزرتا ہے۔ لالہ سمر کانت جیسے لوگ بھی تحریک میں میں شامل ہوتے ہیں۔ لالہ سمر کانت ہڑتال کا نعرہ لگاتے ہوئے موجودہ حالات کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں

"ہڑتال کرنا ہوگی۔ دوسرا کوئی علاج نہیں ہے اور ہڑتال ایک دو دن کے لئے نہیں ہوگی وہ اس وقت تک رہے گی جبتک ہمارے شہر کے دیوتا ہماری آواز نہیں سنیں گے۔ ہم غریب ہیں بے کس ہیں بے زبان ہیں لیکن جو لوگ بڑے آدمی کہلاتے ہیں۔ وہ اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو انھیں معلوم ہوگا کہ انھیں غریب، بے کس بے زبان آدمیوں نے ہی بڑا آدمی بنایا ہے۔ یہ بڑے بڑے محل کون جان ہتھیلی پر رکھ کر بناتا ہے۔ ان کپڑوں کے ملوں میں کون اپنا پسینہ بہاتا ہے۔ شہر کے نوے فیصد آدمی ان دس فیصد آدمی کے لئے اپنا خون جلا رہے ہیں۔ ان کا انعام یہ ہے کہ دس فیصد کے لئے سارا شہر چاہئے اور نوے فیصد کے لئے ایک گوشہ بھی نہیں۔ ہر کسی کی ذمہ داری ہے کہ شہر کے چھوٹے بڑے امیر غریب سب ہی آدمی تندرست رہ سکیں۔ اگر ہماری میونسپلٹی اس مقدم فرض کو پورا نہیں کرتی ہے تو اسے توڑ دینا چاہئے"۔(۱)

اس ناول میں اگر امر کانت جیسے لوگ عدم وتشدد پر زور دیتے ہیں تو دوسری طرف باغیانہ خیالات کی رہنمائی کرنے والے کردار بھی سامنے آتے ہیں جس کی بہترین مثال لالہ سمر کانت اور سکھدا جیسے لوگ ہیں۔ جو کسی بھی حالت میں مصالحت پر رضامند نہیں ہوتے۔ عوام انکو کھڑے ہوئے ہیں۔ عوام نے اپنے مقصد کو خود اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے۔ انھیں کوئی طاقت آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی ہے۔ سماجی نا انصافی کے خلاف انقلاب کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ناول میں بھی انقلابی کرداروں کی ایک لمبی قطار دیکھنے کو ملتی ہے جو اپنے بازوؤں کی

قوت پر بھروسہ کرتے ہوئے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

برطانوی اقتدار کے قیام کے بعد ہندوستان کا معاشی و اقتصادی نظام پوری طرح تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ آمدنی کے ذرائع یا تو وہ ٹیکس تھے جو عوام سے وصول کئے جاتے تھے یا پھر لگان اور مال گزاری تھی جس کی وصول یابی کے لئے کسانوں کے ساتھ جانوروں کا سلوک کیا جاتا تھا۔ غریب کاشتکاروں پر بے جا مظالم ڈھائے جاتے تھے۔

ہندوستانی کسانوں کی معاشی حالت روز بروز پست ہوتی جا رہی تھی اور اس بڑھتی ہوئی مفلسی نے کاشتکاروں کی محنت و مشقت پر بھی اثر ڈالا تھا جس کی کمی نے پیداوار کو متاثر کیا۔ فصلوں کے تباہ ہونے اور قحط سالی کی صورت میں کسانوں کو اور بھی زیادہ مشقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن برطانوی سامراجیت کو ذرا بھی فکر نہ تھی۔ ۱۹۳۰ء کے قریب نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے دوسرے سامراجی ممالک میں بھی معاشی حالت بہتر نہیں تھی اور اس مصیبت کا بوجھ سب سے زیادہ کسانوں پر پڑتا تھا۔ پریم چند نے کسانوں کی بڑھتی ہوئی مصیبتوں کی عکاسی کچھ اس طرح کی ہے۔

> "لیکن اب کی یکایک جنس کا بھاؤ گر گیا۔ اور اس حد تک جا پہونچا جتنا چالیس سال پہلے تھا۔ جب بھاؤ تیز تھا تو کسان اپنی پیداوار بیچ کر لگان دے لیتا تھا لیکن جب دو اور تین کی جنس ایک میں بکے تو وہ غریب کیا کرے۔ کہاں سے لگان دے کہاں سے دستوریاں دے۔ کہاں سے قرض چکائے۔ بڑا مشکل مسئلہ تھا اور یہ حالات کچھ اس علاقہ کی نہ تھی سارے صوبے سارے ملک یہاں تک کہ ساری دنیا میں یہی کساد بازاری تھی۔۔۔۔۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے پر بھی لگان کا نصف ادا نہ کر سکے اور تھاکر دوارے میں وہی جشن تھے۔ وہی جل بہار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حلقہ میں کہرام مچ گیا۔"[19]

پریم چند دنیا کی معاشی پست حالی و تباہ و بربادی نیز ہندوستان اور اپنے علاقہ کے حالات سے بخوبی واقف تھے اور وہ اس کا حل ڈھونڈنا چاہتے تھے۔ ہر چند کہ آتما نند اور امر کانت کی کوششوں سے

اس علاقہ میں تھوڑی بہت آسانیاں مل چکی تھی۔ تعلیم کا پرچار بھی ہو چکا ہے۔ لوگوں نے کچھ گاؤں میں دستوری دینا بند کر دیا تھا۔ آتمانند کی صدارت میں گنگا کے کنارے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے پنچایت ہوتی ہے۔ آتمانند اس کے صدر چنے جاتے ہیں۔ یہاں پر دو قسم کے خیالات کا ٹکراؤ ہوا ہے۔ امرکانت کہتا ہے

"یہ آفت ہمارے اوپر نہیں ہے بلکہ
سارے ملک میں یہی ہاہا کار مچا ہوا ہے۔ ہمارے لیڈران کو حل کرنے کی کوشش
کر رہے ہیں انھیں کے ساتھ ہمیں بھی چلنا ہے" ۹۱

لیکن عوام اس قسم کے نیتاؤں سے پریشان ہو چکی تھی۔ عوام امرکانت کی بھی تقریر سنکر اداس بیٹھی رہتی ہے وہ اس کی عزت کرتے تھے اسلئے کوئی اودھم نہیں ہوا لیکن ان پر تقریر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عوام کو اب امرکانت جیسے لیڈروں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ انھیں برداشت اس لئے کر رہی تھی کہ ان میں سے کچھ لوگ تو اس کی عزت کرتے تھے۔ آتمانند کا کہنا تھا کہ مہنت جی کا گھر گھیر لیا جائے اور وہ جب تک لگان نہ چھوڑ دے ان کا کوئی انسو نہ پونے دیا جائے۔ ان دونوں نیتاؤں کے ٹکراؤ کی وجہ سے سبھا میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ امرکانت اسکے بعد مہنت جی سے صلح کرنے کے لئے بات چیت کرنے جاتا ہے۔ وہاں اسے ایک دوسری دنیا دکھائی دیتی ہے اور ناامید ہو کر اس کو واپس لوٹنا پڑتا ہے۔ آخر دوسرے دن جب امرکانت کارکنوں، محرروں اور چپراسیوں کی خوشامد کرتا ہے تو اسکی عرضی پر غور ہوتا ہے۔ گاؤں کے لوگ بھی اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا روپیہ میں آٹھ آنہ چھوٹ ہو گئی تو کوئی کہتا مہنت جی نے اس سال پورا لگان معاف کر دیا ہے۔ آخر کار امرکانت مہنت جی سے ملاقات کرنے کے بعد سرکار سے جلد ہی خط و کتابت کرنے اور کارندوں کے ذریعہ سختی نہ کئے جانے کی یقین دہانی لیکر خوش خوش لوٹتا ہے وہ مہنت جی کی حمایت میں کسانوں کو سمجھاتا ہے

"مہنت جی کو تم لوگ خوامخواہ
بدنام کر رہے ہو۔ وہ تو ایسے ڈھنگ سے ملے کہ کیا کہوں" ۹۲

اگر کسانوں نے عرضی اور فریاد کا راستہ چھوڑ کر کوئی اور

راستہ اپنایا ہوتا تو یہ سہولیات بھی نہ ملتی اور اس کے نتیجہ سے انھیں دبائے رکھنے کی کوشش کرتا ہوا کہتا ہے

"ملہار تو شور مچاؤ گے تو کچھ نہ ہوگا الٹے اور ڈنڈے برسیں گے" ۲۱

امرکانت کی کوششوں سے کسانوں کی حالت میں کچھ سدھار ہوتا ہے۔ امرکانت جو کہ عدم وائلنس پر زور دیتا ہے اور اسی راستہ پر چل کر آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے مگر آتما نند تشدد کا حربہ استعمال کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں اس بات کا احساس ہو چکا ہے کہ ہندوستان کی عوام اپنے حقوق سے واقف ہو چکی ہے اور طاقت کے زور سے بھی حاصل کر سکتی ہے۔ یہاں انڈین نیشنل کانگریس کے نرم اور گرم دل دونوں کی نمائندگی ملتی ہے۔ میدان عمل تحریک آزادی سے متعلق ایک ناول ہے جو اسی عہد میں لکھا گیا جب ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد فروغ پر تھی۔ پریم چند نے اس ناول میں آزادی کی اجتماعی جدوجہد کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول میں محنت کش مزدور طبقہ اور کسانوں کو اپنے مسائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اچھوت اور پسماندہ لوگوں کی زندگی کے حالات کی بھرپور عکاسی بھی ملتی ہے۔ جگہ جگہ انگریزی سرکار سے نفرت کا اظہار بھی ملتا ہے۔ ناول میں اگر ایک طرف فرنگیوں کی پھیلائی ہوئی معاشی واقتصادی بدحالی کا ذکر ہے تو دوسری طرف گاؤں کے زمیندار طبقہ کے عیش وعشرت کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں بکھری پڑی ہیں۔

میدان عمل کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ پریم چند نے اس ناول میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ساتھ ساتھ تحریک آزادی میں شامل ہوتے ہوئے دکھلایا ہے جو کہ اس وقت کی ایک اہم ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ برطانوی حکومت نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے مختلف قسم کی شاطرانہ چالوں سے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مذہب کے نام پر لڑا کر دونوں فرقوں کے درمیان آپسی نفرت اور بغاوت کے جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ مذہب کے نام پر ایک دوسرے کا خون کیا جاتا تھا۔ مذہب کے نام پر ہی مختلف سیاسی جماعتیں وجود میں آچکی تھیں۔ جو اپنے اپنے فرقے اور مذہبی حقوق کی حفاظت کی بات کر رہی تھیں۔ پریم چند کو اس بات کا احساس تھا۔ وہ حصول آزادی کے لئے قومی اتحاد اور ہندو مسلم یکجہتی کی اہمیت کو سمجھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ملک کے تقریباً سبھی طبقوں کو انھوں نے اپنے ناول میں

ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں شامل کیا ہے۔ انہوں نے خصوصاً تحریک آزادی کی جدوجہد میں مزدوروں اور کسانوں کی حالت کو زیادہ ابھارا ہے کیونکہ اس طبقہ کا استحصال کچھ زیادہ ہی ہو رہا تھا۔ اچھوتوں کے ساتھ اعلیٰ طبقہ کے مظالم کے علاوہ مسلمانوں کی شمولیت کو بھی کافی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمان بھی ملک کی آزادی کے لئے قدم سے قدم ملاکر چل رہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ فرقہ پرست تنظیمیں وجود میں آچکی تھیں جو کہ علٰحدہ حقوق کی بات کر رہی تھیں۔

پریم چند کو اس بات کا احساس تھا کہ جب تک ہندو مسلم اختلاف کی خلیج پاٹی نہیں جائے گی۔ ملک کامیابی کی منزل تک نہیں پہونچ پائے گا اور نہ ہی اپنے مقصد میں کامیاب ہو پائے گا۔ یہ پریم چند کا ایمان تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے میں پنڈت اور کٹھ ملا برابر کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ اسلئے انہوں نے ان طبقوں کو بے نقاب کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مسلمان انتہا پسندوں کو بے نقاب کرنے میں تھوڑا تکلف کیا ہے لیکن ہندوؤں کی اخلاقی، سماجی اور مذہبی برائیوں کو واضح طور پر بے نقاب کیا ہے۔ مثال کے طور پر ہوئے رام شاستری کے کردار کو لیجئے جو علاقہ کا ذمہدار ہے عیش وعشرت کی زندگی گزارتا ہے اور اس کی لوٹ کھسوٹ جاری رہتی ہے۔

پریم چند نے ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی پر زور دینے کے لئے جو اہم نمائندہ مسلم کردار تخلیق کئے ہیں وہ "سلیم" "بوڑھی پٹھانی" "سکینہ" اور "کالے خاں" وغیرہ ہیں۔ ناول کے ہیرو امرکانت کا دوست اور ہم جماعت "سلیم" ایک لاابالی طبیعت کا مالک ہے۔ امیر والدین کی اولاد ہونے کے باعث وہ زندگی کی حقیقت کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا ہے۔ امرکانت کے والد بھی امیر ہیں مگر امرکانت کا جھکاؤ شروع سے ہی سماجی اخلاقی اور سیاسی تحریکوں کی طرف ہے۔ اور وہ شروع سے ہی اپنے والدین کی ناراضگی کے باوجود ان تحریکوں میں عملی حصہ لیتا ہے۔ وہ اپنے والد کے پیشے کے بھی خلاف ہے اسلئے دونوں کی آپس میں بنتی بھی نہیں۔ یہاں تک کہ امرکانت کے والد اس کو چالیس روپیہ فیس دینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ فیس کی ادائیگی کے وقت امرکانت کلاس سے باہر چلا جاتا ہے۔ اور باہر اسکول کے احاطہ میں افسردہ بے قرار درخت کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے۔

امتحان میں نہ بیٹھنے کا ملال ہے اسلئے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے ہیں۔ سلیم کو پتہ چلتا ہے تو وہ اس کو ڈھونڈ کر کلاس میں لاتا ہے اور اپنے پاس سے اس کی فیس ادا کرتا ہے۔ شام کو چھٹی کے وقت جب دونوں گھر جانے لگتے ہیں تو امر کانت نے کہا

"تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے۔۔۔۔

سلیم نے اس کے منھ پر ہاتھ رکھکر کہا۔ بس خبردار جو منھ سے ایک آواز بھی نکلی۔ دوستی میں احسان کا کیا ذکر ہے۔"

میٹرک پاس کرکے دونوں کالج میں داخل ہو گئے۔ ایک مرتبہ کالج کے پروفیسر ڈاکٹر شانتی کمار کی رہنمائی میں کالج کے کچھ لڑکے جن میں امر کانت اور سلیم بھی شامل تھے گاؤں کی اقتصادی حالت کا مطالعہ کرنے کے لئے گئے تو وہاں کے گاؤں کے لوگوں کی افلاس بیماری اور بیکاری کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ واپسی پر دیکھا کہ ایک جگہ ارہر کے کھیت کے باہر دو گورے اکڑے کھڑے تھے۔ دور کچھ فاصلہ پر کھیت میں عورت کی عصمت دری کر رہے تھے۔ لیکن دیہاتیوں میں ہمت نہیں تھی کہ وہ انکی خبر لیتے۔ کالج کے لڑکوں نے ان کی خوب مرمت کی ان میں سلیم سب سے پیش پیش تھا۔ اس کے بعد سین بدلتا ہے۔ جس عورت کی عزت گوروں نے لوٹی تھی وہ اپنے گھر واپس نہیں جاتی بلکہ بدلہ کی آگ سینہ میں دبائے نیم پاگل کی حالت میں گھومتی رہتی ہے اور ایک روز لالہ سمر کانت کی دوکان کے سامنے دو گوروں کو قتل کر دیتی ہے۔ اس پر مقدمہ چلتا ہے سخت ہلچل مچتی ہے۔ اس عورت کے مقدمہ کی پیروی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ فیصلہ سے ایک روز قبل لوگوں کا خیال تھا کہ فیصلہ خلاف جائے گا۔ کیونکہ وہ گورے برطانوی سرکار کے نمائندہ تھے۔ امر کانت اور سلیم جوش جوانی میں فیصلہ کرتے ہیں کہ اگر فیصلہ اس کے خلاف جائے گا تو وہ کسی غنڈے سے جج کے سر پر جوتا چلوائیں گے اور بے عزتی کروائیں گے۔ ایک پروفیشنل غنڈہ "کالے خاں" کو سلیم دو سو روپیہ پر طے کر لیتا ہے۔ روپیہ کا بندوبست امر کانت کو کرنا تھا اور امر کانت پچھلی رات اپنی بیوی کی زچگی کے سلسلہ میں رات بھر مصروف رہتا ہے اور بندوبست نہیں کر سکا۔ لیکن سلیم کی درخواست پر کالے خاں راضی ہو جاتا ہے

یہاں پر پریم چند نے یہ دکھلایا ہے کہ انگریزوں کے ہاتھوں

نہ صرف ہمارا معاشی استحصال ہو رہا ہے بلکہ ہماری بہو بیٹیوں کی عزت پر بھی حملے کئے جاتے ہیں۔ اب ان کی عزت بھی محفوظ نہیں ہے۔ مزدوروں اور گاؤں کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے سلیم نے کہا۔

"تم اتنے آدمی کھڑے دیکھتے رہے
اور تم سے کچھ نہ ہو سکا۔ تم میں اتنی غیرت بھی نہیں۔ اپنی بہو بیٹی کی
آبرو کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سمجھتے ہو کہ یہ کون ہماری بہو بیٹی ہے۔
اس ملک میں جتنی بیٹیاں ہیں سب تمہاری بیٹیاں ہیں۔ جتنی بہوئیں ہیں
سب تمہاری بہوئیں ہیں۔ جتنی مائیں ہیں سب تمہاری مائیں ہیں۔ تمہاری
آنکھوں کے سامنے ایک غریب عورت کی آبرو ریزی ہوئی اور تمہارے
خون میں ذرا بھی جوش نہیں آیا۔ سب جا کر مر کیوں نہیں گئے۔"[۲۳]

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد دونوں کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ امرکانت گھر بار چھوڑ کر ہردوار کے قریب اچھوتوں کے گاؤں میں چلا جاتا ہے اور وہاں گرام سدھار کے کاموں میں حصہ لینے لگتا ہے۔ اور سلیم سول سروسز کا امتحان پاس کر کے اسی علاقہ میں افسر بنکر آتا ہے۔ امرکانت اس سے ملاقات کی خاطر اس کے بنگلہ پر جاتا ہے۔ مسٹر سلیم اپنے بڑے افسر مسٹر غزنوی سے بھی امرکانت کی ملاقات کرواتا ہے۔ غزنوی بھی امرکانت سے کافی متاثر ہوتا ہے۔ سلیم سے ملاقات کے بعد امرکانت کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس علاقہ کے مہنت زمیندار کے کارندے آسامیوں سے لگان وصول کرنے جبری بیگار لینے اور بے دخلیوں کے سلسلہ میں جو ہر طرح کے مظالم ڈھا رہے ہیں۔ ان کے خلاف کچھ کیا جائے۔ بغیر خون خرابے کے حالات سدھر جائیں۔ لیکن حالات اور زیادہ مخدوش ہو جاتے ہیں۔ آخر کار امرکانت اشتعال انگیز تقریر کرنے کے جرم میں گرفتار ہو کر جیل چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد سلیم نے گردونواح کے سبھی علاقوں کا دورہ کیا تو کاشتکاروں کی ناگفتہ بہ معاشی اور اقتصادی حالت دیکھ کر اسکی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ استعفیٰ دینے کی سوچنے لگا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ سرکاری ملازمت اس لئے نہیں ہے کہ اسکے ذریعہ رعایا پر مظالم ڈھائے جائیں بلکہ اس لئے ہے کہ رعایا کی کچھ خدمت کی جا سکے اور انکی حالت

میں کچھ سدھار لایا جا سکے۔ سلیم کے بڑے افسر مسٹر نزلوی نے سلیم کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی تو سلیم نے جواب دیا۔

"میرا دعویٰ تو یہ ہے کہ سرکار رعایا
کے لئے ہے۔ رعایا سرکار کے لئے نہیں ہے۔ کاشتکاروں پر ظلم کرکے
انہیں بھوکوں مار کر اگر گورنمنٹ زندہ رہنا چاہتی ہے تو کم سے کم میں
اس سے الگ ہو جاؤں گا۔ اگر مالیات میں کمی کا اندیشہ ہے تو سرکار
کو اپنے مصارف کم کرنے چاہئیں نہ کہ رعایا پر سختیاں کی جائیں۔ میں جانتا ہوں
کہ سرکار پر میری علیحدگی کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن میرے ضمیر
کو اطمینان ہو جائے گا۔"[۲۴]

اور اس کے بعد نوکری سے استعفیٰ دے کر امرکانت کی چلائی گئی تحریک
کی باگ ڈور سنبھال لیتا ہے۔

"تحریک کی لگام سلیم کے ہاتھوں میں آتے ہی
لوگوں کے حوصلے بندھ گئے۔ جیسے پہلے امرکانت آتما نند کے ساتھ گاؤں گاؤں
دورا کرتا تھا اسی طرح سلیم دوڑنے لگا۔ وہ سلیم جس کے خون کے لوگ
پیاسے ہو رہے تھے اب علاقہ کا شاہ بے تاج تھا۔"[۲۵]

قومی یکجہتی کے سلسلہ میں یہاں ہندو معاشرہ کی ایک سنگین خرابی کا ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا جو کہ آزادی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ چھوا چھوت اونچ نیچ کی لعنت جس نے ہندوؤں کے ایک بڑے طبقہ کو پسماندہ بنا کر زندگی کی دوڑ میں پیچھے کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ مسلمانوں کے ساتھ خورد و نوش سے اجتناب کرتا تھا۔ جس کے باعث مسلمانوں کے دلوں میں ایک گرہ سی پڑی ہوئی تھی۔ پریم چند کو اس برائی کا احساس تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب تک یہ خرابی دور نہیں ہوگی ہندو مسلم اتحاد کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی متحد ہو کر آزادی کی جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند نے

ناول میں امرکانت اور سلیم کو ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے دکھلایا ہے۔ سلیم کے افسر بننے کے بعد امرکانت جب اس سے ملنے جاتا ہے تو دونوں نہ صرف اکٹھے کھانا کھاتے ہیں بلکہ باری باری ایک ہی حقہ کے کش بھی لگاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مزے کی بات یہ ہے کہ لالہ سمرکانت اپنے بیٹے کی چلائی ہوئی تحریک میں تن من دھن سے حصہ لیتے ہیں۔ جبکہ بہی لالہ سمرکانت شروع سے ہی اسکی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ ایک مرتبہ ان کی ملاقات سلیم سے اس کے بنگلہ پر ہوتی ہے۔ کھانے کا وقت ہوجاتا ہے اور سلیم انھیں ایک ہی دسترخوان پر کھانے کے لئے راضی کرلیتا ہے۔

اس ناول میں پریم چند نے اپنے نظریہ کی تبلیغ کے لئے سلیم کے بڑے افسر مسٹر غزنوی کے کردار کو بھی استعمال کیا ہے اور مسلمانوں کے دلوں میں جو شکوک سر اٹھا رہے تھے کہ آزادی ملنے کے بعد وہ محفوظ نہیں رہیں گے۔ کیونکہ ہندو مہاسبھا جیسی تنظیمیں ہندو راشٹر کی باتیں کر رہی تھیں۔ جن سے گھبرا کر مسلمانوں نے بھی علیحدہ ملک بنانے کی مانگ شروع کردی تھی۔ فرقہ پرستی کی ہوائیں پورے ملک میں پھیلتی جارہی تھی۔ ان حالات میں لوگوں کے دلوں میں جو شبہات اور نفرت پیدا ہوتی جارہی تھی وہ پریم چند نے مسٹر غزنوی کے منھ سے کہلوائے ہیں۔ اور ان شکوک کو مسٹر غزنوی کی زبانی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

"سوراج ہم بھی چاہتے ہیں مگر انقلاب کی صورت میں نہیں حالانکہ کبھی کبھی مجھے یہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب کے سوا ہمارے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے..... مجھے سوراج سے اگر کوئی خوف ہے تو یہ کہ مسلمانوں کی حالت کہیں اور زیادہ خراب نہ ہوجائے۔ غلط تاریخیں تو پڑھ پڑھ کر دونوں قرقے ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے ہیں۔ مسلمان فاتح تھے اور قیاس کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندوؤں پر زیادتیاں کی ہوں گی۔ ہندو فاتح ہوتے تو وہ بھی مسلمانوں پر یہی زیادتیاں

کرتے ۔ ممکن نہیں کہ ہندو موقع پاکر مسلمانوں سے فرضی عداوتوں کا
بدلہ نہ چکائے ۔ لیکن اس خیال سے تسلی ہوتی ہے کہ اس بیسویں
صدی میں ہندو جیسی پڑھی لکھی قوم مذہبی گروہ بندی کی پناہ نہیں لے سکتی۔
مذہب کا دور ختم ہو رہا ہے بلکہ یوں کہو کہ ختم ہو گیا صرف ہندوستان
میں اسکی کچھ جان باقی ہے۔ یہ معاشیات کا دور ہے ..... آج شاید
ہی کوئی تعلیم یافتہ ملے جو مساوات کا حامی نہ ہو۔ آخر ایک دو صدی بعد دنیا
میں ایک سلطنت قائم ہو جائے گی ۔ ساری دنیا کے لئے ایک قانون
ہوگا ایک نظام ہوگا ایک معیار ہوگا۔ قوم کے خادم قوم پر حکومت کریں گے۔
مذہب محض ایک شخصی چیز رہ جائے گی ۔ حاکم اور محکوم کی تمیز
اٹھ جائے گی ۔"[۲۶]

بوڑھی پٹھانی اور سکینہ کا کردار بھی کافی اہمیت رکھتا ہے

پریم چند نے ان کا تعارف ناول کے شروع میں غریب اور پسماندہ کی حیثیت سے کروایا تھا۔ یہ عورتیں بھی امرکانت کی چلائی ہوئی تحریک میں شامل ہو جاتی ہیں ۔ بوڑھی پٹھانی اور سکینہ کو جیل ہو جاتی ہے۔ جیل میں ان کی ملاقات امرکانت، سکھدا اور سلیم سے ہوتی ہے ۔ ہر چند کہ یہ لوگ نچلے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اپنے اردگرد کے سیاسی ماحول سے بے خبر نہیں رہتے اور آزادی کی تحریک میں شامل ہو کر قدم سے قدم ملا کر چلتی ہیں۔

پریم چند نے شروع ہی ناول میں "کالے خاں" کا تعارف
ایک چور کے حیثیت سے کرایا تھا جو کہ لالہ سمرکانت کی غیر موجودگی میں چوری کئے ہوئے سونے کے کڑے فروخت کرنے کے لئے امرکانت کے پاس آتا ہے اور دو سو روپیہ کا مال تیس روپیہ میں دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن امرکانت لعنت ملامت کرکے اس کو واپس بھیج دیتا ہے ۔ بعد میں سلیم اس کو زچ پر جوتا پھینکنے کے لئے لاتا ہے ۔ آخر میں امرکانت جب کاشت کاروں کی تحریک میں گرفتار ہو کر جیل جاتا ہے تو کالے خاں بھی کسی چوری غنڈہ گردی کے الزام میں سزایاب

ہو کر قید تنہائی رہا ہوتا ہے۔ اور امرکانت جیل میں اعلیٰ درجہ میں رہنے کے بجائے عام قیدیوں کے ساتھ رہتا ہے وہاں اسکی ملاقات کالے خاں سے ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنی رام کہانی سناتے ہیں۔ دونوں ایک ہی چکی پر آٹا پیستے ہیں۔ امرکانت جلد ہی تنگ جاتا ہے۔ کالے خاں امرکانت کو بٹا کر سارا آٹا پیس ڈالتا ہے اور کہتا ہے

"مگر یہ تو اچھا نہیں لگتا ہے کہ تم میرے ساتھ چکی پیسو۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ رعایا کے پیچھے سرکار سے لڑے ہو۔ میں تمہیں نہ پیسنے دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری خدمت کے لئے ہی اللہ نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ اس کی قدرت کون سمجھ سکتا ہے۔ آپ ہی آدمی سے برائی کرواتا ہے آپ ہی سزا دیتا ہے۔ آپ ہی اسے معاف کر دیتا ہے ..... کالے خاں کا تند چہرہ اس گہری نورانی ہمہ گیر عقیدت سے منور ہو اٹھتا ہے۔ آنکھوں میں روحانیت کا جلوہ چمک اٹھا اور لہجہ اتنا معرفت خیز کہ امرکانت کا دل مسرت سے شگفتہ ہو گیا گویا کسی دیوتا کے درشن کر رہا ہو"[۲۵]

اپنا کام ختم کرنے کے بعد کالے خاں چھپر کے نیچے کمبل بچھا کر نماز پڑھتا ہے۔ اتنے میں نائب داروغہ چار وارداتوں کے ساتھ آٹا تلوانے آتا ہے۔ امرکانت کے پاس پہونچ کر اس کے جوڑی دار کے بارے میں دریافت کرتے ہیں جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ کالے خاں نماز پڑھ رہا ہے تو اسکا پارہ چڑھ جاتا ہے اور وہ کالے خاں کی اس قدر پٹائی کرتا ہے کہ وہ دنیا سے کوچ کر جاتا ہے۔

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پریم چند نے ملک کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کی شمولیت کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے مختلف مسلم کرداروں کو بھی پیش کیا ہے۔ میدان عمل میں پریم چند نے ہندوستان کی تحریک آزادی کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

اس میں کرداروں کا ایک طویل سلسلہ دیکھنے کو ملتا ہے جو آزادی کی تحریک میں شامل ہوتے ہیں اور ملک کی آزادی کے لئے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں۔ گویا "میدان عمل" کی بنیاد انھیں مسائل پر رکھی گئی ہے جو اس عہد میں جاری تھی یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ "میدان عمل" میں تحریک آزادی کی عکاسی جس وضاحت کے ساتھ کی گئی ہے اس کی مثال کسی دوسرے اردو ناول میں نہیں ملتی۔ میدان عمل کی مدد سے تحریک آزادی کی ایک مکمل تصویر بنائی جا سکتی ہے جس میں جدوجہد آزادی سے متعلق کوئی پہلو تشنہ نہیں ہے۔ اس اعتبار سے میدان عمل اردو کی ایک اہم تصنیف ہے۔

حوالہ جات

۱۔ امرت رائے۔ پریم چند کی پراسنگکتا۔ ص۔ ۱۰۲

۲۔ مدن گوپال۔ قلم کا مزدور۔ ص۔ ۱۲۶

۳۔ کمل کشور گوینکا۔ پریم چند وشو کوس۔ ص۔ ۳۲۶

۴۔ قمر رئیس۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ۔ ص۔ ۲۹۷

۵۔ قمر رئیس۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ۔ ص۔ ۲۹۶

۶۔ اندر موہن کمار سنگھ۔ پریم چند یوگین بھارتی سماج۔ ص۔ ۱۸۵

۷۔ سید حیدر علی۔ اردو ناول سمت و رفتار۔ ص۔ ۱۰۵

۸۔ قمر رئیس۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ۔ ص۔ ۲۸۳

۹۔ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۳۳

۱۰۔ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۵۰

۱۱۔ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۵۲

۱۲۔ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۷۳

۱۳۔ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۶۸

۱۴۔ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۱۳۱

۱۵۔ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۳۴۳

۱۶۔ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۳۷۷

۱۷۔ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۳۸۵

۱۸۔ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۳۷۲

۱۹۔ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۳۷۵

۲۰ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۳۸۰

۲۱ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۳۸۰

۲۲ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۱۰

۲۳ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۲۶

۲۴ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۲۶۶

۲۵ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۲۶۷

۲۶ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۲۰۵

۲۷ پریم چند۔ میدان عمل۔ ص۔ ۲۸۵

کتابیات

کتابیات

1 - انجینئر - اصغر علی - پریم چند حیات اور فن - این سی ای آر ٹی دلی - ١٩٨١ء

٢ - ایوب، ہارون - اردو ناول پریم چند کے بعد - اردو پبلشرز نظیر آباد لکھنؤ - ١٩٧٨ء

٣ - بپن چندر - املیش ترپاٹھی - برون ڈے - جدوجہد آزادی - نیشنل بک ٹرسٹ - دلی - ١٩٨٣ء

٤ - بپن چندر - جدید ہندوستان - این سی ای آر ٹی دلی - ١٩٧٩ء

٥ - تاراچند - بھارتی سونتنترتا آندولن کا اتہاس - پرکاشن وبھاگ دلی - ١٩٦٩ء

٦ - جہا، منورنجن - جدوجہد آزادی میں مرکزی مجلس قانون ساز کا رول - نیشنل بک ٹرسٹ دلی - ١٩٧٣ء

٧ - جوہرا، پی این - بھارت کا سماجک سنسکرتک اور آرتھک اتہاس - ایورسٹ پریس دلی ١٩٧٥ء

٨ - حسینی، علی عباس - ناول کی تاریخ و تنقید - انڈین بک ڈپو - لکھنؤ - ١٩٨٠ء

٩ - حسینی، مجتبیٰ - اردو ناول کا ارتقا - پروین بک ڈپو لکھنؤ - ١٩٧٤ء

١٠ - دلوی، نشیورانی - پریم چند گھر میں - رام لال پوری آتمارام اینڈ سنس پبلشرز - ١٩٥٦ء

١١ - رضا، جعفر - پریم چند کہانی کا رہنما - نیشنل آرٹ پرنٹرس الہ آباد - ١٩٦٩ء

١٢ - رضا، جعفر - پریم چند فن اور تعمیر فن - تاج آفسٹ پریس الہ آباد - ١٩٨٠ء

١٣ - رہبر، ہنس راج - پریم چند - مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - دلی - ١٩٦٠ء

١٤ - رائے، امرت - ونب - وودھ پرسنگ - [illegible] - ہنس پرکاشن الہ آباد - ١٩٧٨ء

١٥ - رائے، امرت - زنیب - پریم چند وودھ پرسنگ - ہنس پرکاشن الہ آباد - ١٩٧٨ء

١٦ - رائے، امرت - پریم چند کی پراسنگکتا - ہنس پرکاشن الہ آباد - ١٩٨٥ء

١٧ - رامیہ، بی پٹا بھائی سیتا - تواریخ کانگریس - نیشنل انڈسٹری بک ڈپو لاہور - ١٩٥٦ء

١٨ - سرمست، یوسف - بیسویں صدی میں اردو ناول - حیدرآباد نیشنل بک ڈپو - ١٩٧٣ء

١٩ - سنگھ، ایودھیا - بھارت کا مکتی سنگرام - سوہن پرنٹنگ سروسیز - ١٩٧٧ء